قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ	خط و کتابت	۴
پاکستان ۴۸/- روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	چار روپے
غیر ممالک ۹۸/- روپے		
جلد ۳۹	جنوری سنہ ۱۹۸۶ء	شمارہ ۱

فہرست

۱۔ لمعات۔ (عائلی قوانین (۱۹۶۱) ——— ۲
۲۔ حقائق و عبر۔ (۱) یہ تیرے پُراسرار بندے (۲) اتحادِ اُمّت اور علماء (۳) مہدی اصغر ۶
۳۔ مساواتِ محمدیؐ۔ (محترم پرویزؒ صاحب) ——— ۹
۴۔ قرآنِ مجید اور سائنسی تحقیق۔ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ——— ۳۲
۵۔ نقد و نظر۔ (۱) الہیاتِ انقلاب (الطاف جاوید صاحب) ——— ۳۹
GATEWAY TO THE QURAN - (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)
۶۔ دین کی باتیں۔ (ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۴۱
۷۔ حفاظتِ قرآن۔ (عبداللہ رفیع اللہ ثانی) ——— ۴۶
۸۔ حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ۔ (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ) ——— ۴۹
(محترم پرویزؒ صاحب)

ناشر ڈاکٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالمجید، مقام اشاعت: ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

لمعات

آج سے پورے پچیس سال پہلے، ملک عزیز میں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء نافذ کئے گئے تھے۔ ان قوانین کے ذریعے ان نا انصافیوں کو ختم کرنے کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا گیا تھا، جن کا شکار ہمارے معاشرے کی بیکس عورتیں تھیں۔ ان عائلی قوانین میں، صغرسنی کی شادی اور ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر بیوی کو جدا کر دینے کو اس بنا پر خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا کہ یہ دونوں رسمیں قرآنی تعلیمات کے خلاف تھیں۔ ان قوانین کے نفاذ کے نتیجے میں ہمارے معاشرے سے یہ غلط رسمیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔

لیکن ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ایک ڈرامے "رنگِ حنا" کو دیکھ کر یہ افسوسناک صورتِ حالات سامنے آئی کہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ٹیلی ویژن کے حکام بلکہ ڈرامے لکھنے والے مشہور اہلِ قلم ابھی تک ان قوانین اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس ڈرامے میں بلاشبہ صغرسنی کی شادی کی قباحتوں کی نشاندہی کی گئی تھی لیکن اس مقصد کے لئے اس بُری رسم کو قانونی طور پر جائز اور اسلامی تعلیمات کے مطابق دکھانا، بالکل غیر ضروری تھا۔ اگر ڈرامہ نویس حمید کاشمیری صاحب کو اس برائی کی شرعی اور قانونی حیثیت کا علم ہوتا، تو وہ اس ڈرامے کو بالکل مختلف انداز سے پیش کرتے۔

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے، صغرسنی کی شادی کا رواج رہا ہے اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی تھیں ان کی طرف بہت کم دھیان دیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں جب مسلمان عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے لگیں تو انہیں اپنے اسلامی حقوق کا احساس ہوا، صغرسنی کی شادی کی وجہ سے معاشرے میں بڑی قباحتیں پیدا ہو رہی تھیں اس لئے سب سے پہلے اس برائی کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ چنانچہ اسلامی ممالک میں سے مصر کو یہ اوّلیت حاصل ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں اس برائی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ لڑکے اور لڑکی کی شادی کی عمر کے لئے مشہور فقیہ امام ابن شبرمہ کے فتویٰ کو اختیار کیا گیا، جنہوں نے اس مقصد کے لئے لڑکے کی عمر اٹھارہ سال اور لڑکی کی عمر سولہ سال مقرر کی تھی۔

یہ ایک ایسا فیصلہ تھا، جس کی ساری اسلامی دنیا میں تعریف کی گئی۔ کیونکہ ہر جگہ صغرسنی کی شادی کے بُرے نتائج نے اسلامی معاشرے کا سکون درہم برہم کر رکھا تھا۔ برِصغیر ہند و پاکستان میں، محترم جناب

مودودی صاحب مرحوم نے اپنی مصری عائلی قوانین کو اردو زبان کا جامہ پہنا کر "حقوق الزوجین" کے نام سے پیش کیا۔ اس کتاب میں وہ صغرسنی کی شادی کی قباحتوں کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے، اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے، جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی رہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں"۔

(حقوق الزوجین جلد ششم صفحہ ۱۱۹)

ملک کے دوسرے روشن خیال علماء نے بھی صغرسنی کی شادی کے خاتمے کے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور آخر الامر عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں اسے خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور یہاں بھی امام ابن شبرمہ کا فتویٰ اختیار کر کے لڑکے کے لئے شادی کی عمر اٹھارہ سال اور لڑکی کیلئے سولہ سال مقرر کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ملک میں کروڑوں لوگ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کسی نے ٹیلی ویژن حکام اور ڈرامہ لکھنے والے اہل قلم کی اس طرف توجہ نہیں دلائی۔

ان عائلی قوانین میں جس دوسری خرابی کا تدارک کیا گیا، وہ طلاق بدعت ہے یعنی ایک ہی مجلس میں بیٹھے بیٹھے طلاق کا لفظ تین دفعہ بول کر، اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے علیحدہ کر دینا۔ طلاق کا یہ طریقہ اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ عائلی زندگی معاشرے کی اہم بنیاد ہے، اس لئے اس بارے میں قرآن مجید میں بڑی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اگر میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور دوسرا بیوی کے خاندان سے مقرر کیا جائے۔ وہ دونوں مل کر بیٹھیں اور ان کے تنازعے کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

اگر یہ ثالث حضرات، اپنی بھرپور کوشش کے باوجود ان کے تنازعہ کو ختم نہ کر سکیں تو پھر اسلام انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے ایسا طریق کار مقرر کیا گیا ہے کہ جدائی کا فیصلہ کرنے والے دونوں فریقوں کو ایسا کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑیگا۔ اس طریق کار کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

شریعتِ اسلامی میں شادی کے اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر عائد ہوتی ہے۔ اگر عورت خاوند سے علیحدگی چاہے گی تو اس کے لئے لازم ہے کہ مرد نے اس پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ اسے واپس کر دے اور علیحدگی حاصل کرے۔ شرعی اصطلاح میں اس طریق کار کو خلع کہتے ہیں۔ یہ حق عورت کو مرد کے حقِ طلاق کے مقابلے میں دیا گیا ہے۔

اگر خاوند علیحدگی کا فیصلہ کرے گا، تو پھر اسے اس تمام مال سے دستبردار ہونا پڑے گا جو اس نے بیوی پر خرچ کیا ہوگا۔ اس صورتِ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ علیحدگی سے پہلے دونوں فریق اچھی طرح سوچ لیں۔

عائلی زندگی میں بعض اوقات ایسی صورتِ حالات پیدا ہو جاتی ہے کہ علیحدگی کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا، تو اس مقصد کے لئے بھی شریعت نے تدریج کا طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ خاوند اپنی بیوی کو پہلے ماہ (طہر کی حالت) میں ایک طلاق دے گا۔ اس ایک طلاق کے بعد میاں بیوی میں صلح صفائی کی گنجائش باقی رہتی ہے اور وہ دوبارہ اپنے تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر خاوند اپنے فیصلے پر قائم ہے، تو وہ دوسرے ماہ اسی طریقے دوسری طلاق دے سکتا ہے۔ اس دوسری طلاق کے بعد بھی میاں بیوی اپنے تعلقات دوبارہ استوار کر سکتے ہیں۔ لیکن تیسرے ماہ، تیسری طلاق دینے کے بعد ان کا یہ حق ساقط ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب ملوکیت نے اسلامی دنیا میں اپنے قدم جمانے شروع کئے تو عامۃ المسلمین نے اسے ناپسند کیا۔ چنانچہ چار و ناچار اگر وہ ان حکمرانوں کی بیعت کر بھی لیتے تھے تو ان لوگوں سے بھی خفیہ تعلقات قائم رکھتے تھے جو اسلامی معاشرے سے ملوکیت کا خاتمہ چاہتے تھے جس کی وجہ سے ملوکیت کی کشتی ہمیشہ ڈولتی رہتی تھی۔ سلاطین نے اس کا علاج بیعت کے ایک ایسے عہدنامے سے کیا، جس میں یہ عہد لیا جاتا کہ اگر بیعت کرنے والا اپنی بیعت سے پھر جائے گا تو اس کی بیوی پر خود بخود تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو مؤثر قرار دیا جائے، ہمارے فقہا نے طلاق کے اس طریقے کو بدعت قرار دیا، لیکن بعض صورتوں میں اسے مؤثر بھی قرار دیا یعنی یہ کہ یہ واقع ہو جاتی ہے۔ ملوکیت نے جو نیا عہد نامہ مرتب کیا تھا، اس کے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ طلاقِ ثلاثہ بیک مجلس کو عام رواج دیا جائے، چنانچہ حکومت نے اس مقصد کے لئے اپنے تمام ذرائع استعمال کئے، یہاں تک کہ عام لوگ اسے طلاق کا واحد اسلامی طریق سمجھنے لگے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس سے اسلامی معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔

مصر میں جب تعلیمیافتہ عورتوں نے اپنے اسلامی حقوق کی بحالی کی جدوجہد شروع کی تو اس کے نتیجے میں ۱۹۳۵ء میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے، ان میں طلاق کے اس غیر اسلامی طریق کو خلافِ قانون قرار دے کر جرم بنا دیا گیا۔ برصغیر کے علماء نے ان مصری قوانین کا خیر مقدم کیا تھا اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب نے انہی قوانین کو ایک کتاب بعنوان "حقوق الزوجین" کی صورت میں پیش کیا۔ اس کتاب میں وہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کی شرعی حیثیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا، نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں، ایک طلاقِ رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاقِ مغلظہ کے حکم میں، لیکن اس کے بدعت اور معصیت

ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں، تو حضورؐ غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَاَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ (کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں) بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلسِ واحد میں تین طلاقیں دینے والا آتا تو وہ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا دی جا سکتی ہے۔

(حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۱۵۴)

چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ جب یہاں کی تعلیمیافتہ عورتوں نے اسلامی حقوق کی بحالی کے لئے جدّوجہد کی تو ۱۹۶۱ء میں یہاں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے ان میں طلاقِ بدعت کو ختم کر کے مسلمانوں کو طلاق دینے کے اسلامی طریقے کا پابند کر دیا گیا۔ ان عائلی قوانین کو ملکِ عزیز میں نافذ ہوئے پورے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک ہمارے بعض علماء ان قوانین سے ناواقف ہیں۔ صغرسنی کی شادی کے بارے میں ان کے طرزِ عمل پر 'لمعات' کی ابتداء میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ طلاقِ ثلاثہ بیک مجلس کے بارے میں بھی ان کا طرزِ عمل کچھ مختلف نہیں۔ اسی کی وضاحت ایک مثال سے ہو گی۔

"روزنامہ جنگ" کے جمعہ ایڈیشن میں ایک کالم، دینی مسائل کے لئے مخصوص ہے۔ جن میں جامعہ اشرفیہ لاہور کے نائب مہتمم صاحب مولانا عبدالرحمٰن، قارئین کے دینی سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ ان کے پچھلے ایک سال کے لکھے ہوئے کالموں پر نظر ڈالی جائے تو شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو گا جس میں انہوں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقوں کو اسلامی طریقۂ طلاق کے طور پر پیش نہ کیا ہو۔ روزنامہ جنگ کا دعویٰ ہے کہ اس کی اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے لاکھوں قارئین میں سے کسی ایک نے بھی اس خلافِ اسلام اور خلاف قانون طریقۂ طلاق کو اسلامی طریقۂ طلاق کے طور پر پیش کرنے پر احتجاج نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ جیسا کہ جنگ کے اس کالم سے معلوم ہوتا ہے، یہ نکلا ہے کہ ہمارے معاشرے میں طلاق کے اس غیر اسلامی طریقے نے رواج پانا شروع کر دیا ہے۔

یہ گذارشات اس لئے پیش کی گئی ہیں کہ ہمارا قانون دان طبقہ اور عورتوں کے حقوق کے لئے کام کرنے والی مختلف انجمنیں، عائلی قوانین کی اس خلاف ورزی کا نوٹس لیں۔ ان قوانین کا تقدس بحال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے جو ادارے اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کے مرتکب ہو رہے ہیں، انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی تلافی کریں تاکہ ان کی بے توجہی کی وجہ سے عوام میں عائلی قوانین کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا تدارک ہو سکے۔

حقائق و عبر

۱۔ یہ تیرے پُراسرار بندے

ہفت روزہ استقلال لاہور اپنی ۱۸ نومبر ۸۵ کی اشاعت میں جوش ملیح آبادی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی معروف تصنیف۔ "یادوں کی بارات"۔ میں اٹلی کے ایک شخص مسمی الوبیرو کا ذکر کیا ہے۔ جسے مصنف کی اپنی زبان میں ملاحظہ فرمایئے:۔

"اس اٹلی کے باشندے سے حیدرآباد دکن میں ملاقات ہوئی تھی۔ چہرہ خوانی میں اسے اس قدر بصیرت حاصل تھی کہ وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کے خیالات معلوم کر لیتا۔ اور پوچھے بغیر اس کے سوالات کے جواب لکھ کر دے دیا کرتا تھا۔ ایک بار سید امین الحسن صاحب بسمل اور نواب اصغر یار جنگ کے ساتھ میں ان سے ملنے جا رہا تھا۔ تو میں نے ان سے موٹر میں یہ کہا کہ میں الوبیرو سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان سے فرنگی راج کب تک ختم ہوگا۔ میرے دونوں دوستوں نے کہا کہ یہ سوال غلط ہے۔ ہم لوگ نظام سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ہمیں سیاسی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہئیے۔ جب ہم اس کے وہاں پہنچے تو ہم لوگوں کے سوالات کے جواب قلمبند کرنے کے بعد۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ نے موٹر میں جو سوال ڈراپ (نظر انداز) کر دیا ہے۔ میں اس سے واقف ہوں۔ لیکن میرا یہ اصول ہے کہ میں سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ سیاسی حیثیت سے آپ بڑے خطرناک قسم کے باغی ہیں۔ اور زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن آپ کا مستقبل بہت شاندار ہے۔

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں انہوں نے اکبری حیدری سے کہا۔ سر اکبر حیدری اس وقت آپ کے دل میں جو بات ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں بتا دوں۔ اکبر حیدری یہ سن کر اچھل پڑے۔ اور کہا آپ برسرعام میرے دل کی بات نہ بتائیں۔ ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا۔ اس نے ایک پرچے پر وہ بات لکھ دی۔ اکبر حیدری دنگ ہو کر رہ گئے۔ اس کے کمال کا اعتراف کیا۔ اور پرچہ کو چاک کر کے جیب میں رکھ لیا۔"

یہ تو خیریت رہی۔ کہ الوبیرو غیر مسلم تھا۔ ورنہ مسلمان اسے ولی اللہ بنا کر چھوڑتے۔

اور آج اس کی قبر مرجع الخلائق بنی ہوئی۔

۲۔ اتحادِ امّت اور علماء

نومبر ۸۵ء کے اواخر روزنامہ جنگ لاہور نے اتحاد امت کے موضوع پر ایک مذاکرے کا انتظام کیا۔ جس میں ہر طبقۂ فکر کے علماء شامل ہوئے۔ اور انھوں نے اتحاد امت کی ضرورت پر بڑی زوردار تقریریں کیں۔ لیکن مذاکرے کے خاتمے پر جب نماز پڑھنے کا وقت آیا۔ تو ان حضرات نے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے خاکسار تحریک کے جناب خان اشرف خان صاحب نے یہ بیان دیا:۔

" علماء کا ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا نہ کرنا ہی ملت اسلامیہ کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنگ فورم میں اتحاد امت کے موضوع پر اظہار کے لئے اکٹھے ہونے والے علماء کا ایک امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنا انتہائی افسوسناک ہے۔ انھوں نے کہا یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کیونکہ گذشتہ قومی اتحاد کی تحریک کے دوران راولپنڈی میں چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) کی کوٹھی پر ہونے والے اجلاس میں ان کی اپیل پر مفتی محمود (مرحوم) نے اکٹھے نماز پڑھنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ تو مولوی غلام علی اوکاڑوی فوراً امامت کے لئے مصلّٰی پر کھڑے ہو گئے۔ مفتی مرحوم اور ان کے رفقاء نے ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ مگر میرے سمیت اجلاس میں شریک تمام احباب کو اس وقت انتہائی افسوس ہوا۔ جب نماز عصر کے وقت مفتی صاحب امامت کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو جناب نورانی اور نیازی صاحب نماز میں شریک ہونے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کر علیحدہ نماز کے لئے اوپر چلے گئے۔ خان اشرف خان نے مزید بتایا کہ سہالہ کی سب جیل میں جب اتحاد کے دس قائدین وہاں نظر بند تھے۔ تو ایک بار پھر میں نے اکٹھے نماز ادا کرنے کی درخواست کی۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں تو تیار ہوں۔ آپ نورانی صاحب سے کہیں کہ ایک نماز وہ پڑھائیں اور دوسری نماز میں پڑھا دیا کروں گا۔ مگر میری انتہائی کوشش کے باوجود نورانی صاحب رضامند نہ ہوئے۔ خان اشرف نے کہا کہ یہی سب سے بڑی وجہ تھی۔ کہ اسلام کے لئے قربانیاں دینے والے عوام کو ان کے رہنماؤں پر اعتماد نہ رہا اور مخالفوں کو یہ موقع مل گیا۔ کہ جو لوگ اکٹھے نماز ادا نہیں کر سکتے۔ وہ اقتدار ملنے پر اسلامی مملکت اکٹھے کیسے چلائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ خاکسار تحریک کے بعد یہ اعزاز اتحاد اسلامی پاکستان کو حاصل ہے۔ کہ جس میں ہر مکتبہ فکر کے افراد شامل ہیں۔ ایک ہی امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ بابت ۲۶ نومبر ۸۵ صفحہ ۲، ۷، پس)

۳۔ مہدی اصغر

آج سے پورے پینتیس سال پہلے یعنی ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ کہ مودودی صاحب کی تقریریں پڑھ کر علماء دیوبند نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا۔ کہ وہ کہیں امام مہدی ہونے کا دعوےٰ نہ کر دیں۔ اس وقت تو اس خدشے کی پرزور تردید کی گئی۔ لیکن اب جماعت اسلامی والوں نے انھیں اس مقام کا حقدار ثابت کرنے کے لئے "مہدی اصغر" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اور مودودی صاحب کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لیے جماعت اسلامی کے شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک صاحب ماہنامہ ترجمان القرآن کی دسمبر ۸۵ء کی اشاعت میں تحریر فرماتے ہیں۔

لوگوں نے امام مہدی کے متعلق یہ تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہوا ہے۔ کہ وہ کسی نبیؐ کی طرح ظہور کرے گا۔ مہدی ہونے کا دعوےٰ کرے گا۔ اور اپنے دعوےٰ کے ثبوت میں کچھ کرامات دکھائے گا۔ لوگ اسے مہدی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں ان چیزوں میں سے کوئی بھی چیز درست نہیں ہے۔ امام مہدی بھی مسلمانوں کے راہنماؤں کی طرح ایک عظیم راہنما ہوں گے۔ صاحب علم و فضل اور متصف بہ جرأت و شجاعت ہوں گے۔ لوگ ان کے علم و فضل اور کام سے متاثر ہو کر اقامت دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ زبردست جہاد کے ذریعہ زمین سے طاغوتی قوتوں کے اقتدار کو ختم کر کے "حکومت الٰہیہ" کا نظام قائم کریں گے۔

احادیث میں اس طرح کے "امام مہدی" کے بارے میں جو پیشگوئی کی گئی ہے۔ اس کا مصداق وہی شخص ہوگا۔ جس کی قیادت میں مسلمان اللہ کے دین کو تمام باطل ادیان پر غالب کر دیں گے۔ اور اس کام کے ہو جانے کے بعد یقینی طور پر کہا جا سکے گا۔ کہ اس امام مہدیؑ کا ظہور ہو گیا۔ جس کے بارے میں نبیؐ نے پیشگوئی فرمائی تھی۔

اس امام مہدی سے پہلے اقامتِ دین کی تحریک برپا کرنے والے قائدین بھی بہرحال اسی زمرے میں شامل ہیں۔ اور احادیث میں ان کے فضائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن "مہدی اعظم" ایک ہی ہوں گے۔ (صفحات ۲۱۹، ۲۲۰)

خیال رہے کہ جماعتِ اسلامی والوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ اس دور میں اقامت دین کی تحریک برپا کرنے والے صرف مودودی صاحب ہیں۔ جماعت اسلامی کی اس پیش رفت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ وقت دور نہیں۔ جب "اصغر" کا لفظ ہٹا کر مودودی صاحب کو 'مہدی اعظم' کا مقام دلوانے کی کوشش کی جائے گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مساواتِ محمدیؐ

قوتِ او ہر کہن پیکر شکست　　نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید　　بندہ را باز از خداوندان خرید

عزیزانِ گرامی قدر سلام و رحمت!

جیسا کہ ہم میں سے ہر ایک کو علم ہے، قرآن کریم کا آغاز ان چار الفاظ سے ہوتا ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات سزا و ارِ حمدیت اس لئے ہے کہ اس نے کائنات کی ربوبیت کا انتظام کر رکھا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں "کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پرورش کرتے ہوئے، بتدریج، مقامِ تکمیل تک پہنچا دینا"۔ علمائے سائنس بتاتے ہیں کہ کرّہ ارض بہت پہلے وجود میں آ گیا تھا۔ اور اس پر زندگی کی نمود بعد میں جا کر ہوئی تھی۔ لیکن جب اس پر زندگی کی نمود ہوئی تو جن عناصر پر زندگی کا دارومدار تھا وہ صفحۂ ارض پر پہلے سے موجود تھے۔ زندگی اپنے نقطۂ آغاز سے، ارتقائی منازل طے کرتی چلی آئی اور ہر مقام پر اسے، اس کے مناسب حال، سامانِ نشوونما ملتا چلا گیا۔ انسان سے پہلے، زندگی محض طبیعی (PHYSICAL) تھی۔ اس لئے اس کی نشوونما کا سامان بھی صرف طبیعی تھا۔ لیکن پیکرِ انسانیت میں پہنچ کر، زندگی محض طبیعی نہ رہی۔ اس نے ایک اور منزل میں بھی اپنا ابتدائی قدم رکھا جسے بغرضِ تعارف "انسانی زندگی" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کو اپنی طبیعی زندگی کے لئے بہرحال طبیعی سامانِ نشوونما کی ضرورت تھی۔ (اس باب میں اس میں اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہ تھا) لیکن اس کی انسانی زندگی کو، اپنی نشوونما و ارتقا کے لئے مستقل اقدار کی ضرورت تھی جو اسے وحی کے ذریعے عطا ہوئیں۔ یہ وحی خدا کی طرف سے حروف و الفاظ کی شکل میں نازل ہوتی تھی۔ اگر انسانی راہنمائی کے لئے صرف الفاظ و نقوش کافی ہوتے تو خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ وحی پر مشتمل ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار دیتا۔ یا ان الفاظ کو کسی پہاڑ کی چٹان پر کندہ کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی وحی کو منتخب افراد کے ذریعے نوعِ انسان تک پہنچایا (جنہیں رسول کہا جاتا ہے) اور ان سے کہہ دیا کہ وہ

اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائیں بھی اور اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں تاکہ ان کا یہ عمل دوسروں کے لئے نمونہ کا کام دے۔ خدا کی یہ وحی

قرآن اور صاحب قرآن

اپنی آخری، مکمل اور غیر متبدل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کا اس پر عمل، جسے خدا نے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) کہہ کر پکارا ہے، زمانہ کے ریگِ رواں پر تابندہ موتیوں کی طرح منقوش۔ قرآن کی تعلیم، اور اس کے مطابق صاحبِ قرآن کا عمل (جو اصولی طور پر خود قرآن کے اندر محفوظ ہے) انسانی زندگی کو اس کے نصب العین تک پہنچانے کے لئے مکمل راہنمائی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے میں نے اپنی کتاب معراجِ انسانیت میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کے لئے جو قوانین دیئے جانے مطلوب تھے وہ انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفٰےؐ رو

(ص ۷۴۔ ۱۹۶۸ء ایڈیشن)

آج کا یہ مبارک و مسعود اجتماع، انہی درخشندہ نقوش کی تابانیوں سے اپنی نگۂ بصیرت کو جلا بخشنے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ جس طرح انسانی زندگی کے متنوع پہلو ہیں، اسی طرح اس شارحِ اسرارِ حیاتؐ کے اسوۂ حسنہ کے بھی متعدد گوشے ہیں۔ آج کے اجتماع میں، میں ان میں سے صرف ایک گوشہ کو پیش خدمت کر سکوں گا۔ جسے (جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہو گا) مساواتِ محمدیؐ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں نے اس موقعہ پر خاص طور پر اس موضوع کو کیوں منتخب کیا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر وضاحت کی جائے گی لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ بطور تمہید، عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو دین ملتا ہے لیکن انسانی خیالات کی آمیزش

دین اور مذہب

اسے مذہب کی پست سطح پر لے آتی ہے۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوتا کہ دین نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس سے قوم بہت بڑے

فریب کا شکار ہو جاتی ہے، مذہب، دین کے الفاظ اور اصطلاحات کو برقرار رکھتا ہے لیکن ان کے معانی مسخ کر کے ان کا مفہوم بدل دیتا ہے، وہ دین کے ارکان واساتین کی شکل و صورت علیٰ حالہٖ قائم رکھتا ہے، لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ قوم، دین کی ان ممی شدہ لاشوں کو زندہ اور زندگی بخش پیکر سمجھ کر ان کی پرستش کرتی اور اسی فریب میں مبتلا رہتی ہے کہ ہم دین کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ مذہب وہ گئوسالہ سامری ہوتا ہے جسے مفاد پرست گروہ تراش کر، قوم کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے، وہ اس سے قوم کو نہ صرف اس فریب میں مبتلا کرتا ہے بلکہ اس کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) جو کچھ اسلام کے نام پر کہا اور کیا جاتا ہے وہ اسی فریب قلب اور طلسم نگاہ کا مظہر ہے۔ یہ وہ غیر اسلامی تصورات و نظریات اور بے جان مناسک و مشارب ہیں جن کے ساتھ لفظ اسلام کا لیبل چپکا کر انہیں عین دین بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ان اصطلاحات میں چند ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے ایک اصطلاح "اسلامی سوشلزم" ہے۔

اسلامی سوشلزم

ہمارا دور عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے جس میں اس معاشی نظام کو خاص شہرت حاصل ہے جو مارکس کی فکری تخلیق ہے۔ (یا یوں کہئے کہ اس نے اس کا احیاء کیا ہے) اس نظام کی ابتدائی شکل کو سوشلزم، اور انتہائی اسٹیج کو کمیونزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مارکس انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی قرار دیتا ہے اور انسانی سطح زندگی کا نہ صرف منکر ہے بلکہ اس کا شدید ترین دشمن، جس کی نشوونما وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے سامنے قرآن کا معاشی نظام ہے نہیں جو نظامِ سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے برعکس، ان کے مذہبی پیشوا اس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو اسلامی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ یہ نظام، جسدِ انسانیت کے لئے جذام اور شرفِ آدمیت کے لئے پیغامِ موت ہے۔ قوم کا حساس طبقہ اس نظام سے ابا کرتا ہے لیکن دوسری طرف سے اس کے سامنے جو نظام (سوشلزم) آتا ہے وہ وحی اور رسالت کے انکار پر مبنی ہے اس لئے وہ اسے بھی بطیبِ خاطر قبول نہیں کر سکتا۔ اس کشاکش کا علاج یہ سوچا گیا کہ اس کا نام سوشلزم کے بجائے اسلامی سوشلزم رکھ دیا جائے۔ میں چونکہ اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ (زیادہ نہیں تو کم از کم) میرا وہ خطاب دیکھ لیں جسے میں نے طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۶۷ء میں پیش کیا تھا اور جو پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہنا

مساواتِ محمدیؐ

چاہتا ہوں کہ ان حضرات سے پوچھئے کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس پریشانیٔ فکر و نظر سے گھبرا کر اب اس کے لئے ایک اور اصطلاح اختیار کی گئی ہے اور وہ ہے مساواتِ محمدیؐ لیکن جس طرح انہوں نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کو مبہم رکھنے میں عافیت سمجھی تھی اسی طرح وہ اب اس جدید اصطلاح مساواتِ محمدیؐ کی بھی وضاحت نہیں کرتے اور یہ نہیں بتاتے کہ اس سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ مساواتِ محمدیؐ کی اصطلاح بڑی مقدس اور عظیم ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہی، دین کا منتہیٰ و مقصود اور اسلام کا ماحصل ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایسا بلند تصور ہے جس کی نظیر فکرِ انسانی پیش نہیں کر سکتا۔ جو معاشرہ، مساواتِ محمدیؐ کی بنیادوں پر متشکل ہو، اسے قرآن، جنتی زندگی کہہ کر پکارتا ہے۔ جو مقامِ آدم کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اسے سوشلزم کا مرادف اور ہم عناں قرار دے دینا اور "روٹی" کی سطح پر لے آنا، پیامِ محمدیؐ تو ایک طرف، خود شرفِ انسانیت کی اتنی بڑی توہین و تذلیل ہے جسے کوئی دیدہ ور قلبِ حساس برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کو حیوان بنا دینے کے مرادف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مارکسی نظریۂ معیشت کے متعلق کہا تھا کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ اب اسی "پیغمبرِ حق ناشناس" کے دین کو، دینِ خداوندی کا لیبل لگا کر پیش کیا جاتا اور مساواتِ محمدیؐ کا حسین و جمیل نقاب اوڑھا کر منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ میں اس مختصر سے وقت میں گذارش کروں گا کہ مساواتِ محمدیؐ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

اسلام سے پہلے

اگر کوئی پوچھے کہ قرآن کریم نے انسان کو وہ کون سی متاعِ عظیم عطا کی ہے جس سے وہ محروم چلا آ رہا تھا اور جس کے ملنے کی اور کوئی شکل نہیں تھی، تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرا دیا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت، عالمِ انسانیت کے مشہور مذاہب تھے، ہندومت کا عقیدہ تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے، انسان چار ورنوں یا طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں باقی تمام انسانوں پر حق حکومت حاصل ہوتا ہے۔ کھشتری اس کے بازوؤں سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے وہ ملک کا دفاع کرتے ہیں۔ ویشیہ اس کے پیٹ سے جنم لیتے ہیں اس لئے روٹی پیدا کرنا ان کا فریضہ ہوتا ہے۔ اور شودر، برہما کے پاؤں کی میل ہوتے ہیں۔ وہ اونچی ذات والوں کی خدمت کے لئے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ ورنوں کی یہ پیدائشی تقسیم اور اس کی رُو سے ہر انسان کے مقام

تقسیم پہلے سے مقدر اور ناقابل تغیر و تبدل سمجھا جاتا تھا اس تفریق مدارج کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جس سڑک پر برہمن چلتے تھے اس پر کسی شودر کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو چاول برہمن کھاتے تھے، شودروں کا ایک دانہ بھی نہیں چکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ رگوید میں یہاں تک لکھ دیا گیا تھا کہ:۔

"اگر کسی عورت کے پہلے دس خاوند غیر برہمن موجود ہوں اور برہمن اس کے ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے گا۔ کیونکہ برہمن ہی درحقیقت ان کے مالک ہوتے ہیں۔

انسانوں کی یہ تقسیم ہندو معاشرہ کے اندر تھی۔ باقی رہے غیر ہندو سو انہیں وہ انسان ہی نہیں قرار دیتے تھے۔ انہیں ملیکش (یعنی ناپاک حیوان) سمجھتے تھے"۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ اس نسل سے باہر کے تمام انسان مردود و ملعون ہیں۔ نہ وہ اس دنیا میں زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے مستحق ہیں نہ ہی اگلی دنیا میں جنت میں قدم رکھنے کے اہل۔ جہاں تک خود بنی اسرائیل کا تعلق ہے وہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے استبداد کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوتے تھے کہ ان کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

عیسائیت آج عالمگیر انسانیت کا مذہب بننے کی مدعی ہے اور مساواتِ انسانیہ کی دعوے دار۔ لیکن (موجودہ محرف) انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ "میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف آیا ہوں"۔ اسی بنا پر وہ اپنے حواریوں کو تاکید کیا کرتے تھے۔ کہ وہ بنی اسرائیل کے گھرانوں تک اپنے پیغام کو محدود رکھیں۔ غیر بنی اسرائیل کی بستیوں کی طرف مت جائیں حتیٰ کہ انہوں نے ان حواریوں سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ دیکھنا، پاک چیز کتوں کو مت دینا اور اپنے موتی سؤروں کے آگے نہ ڈالنا خود عیسائیوں کے اندر حالت یہ تھی کہ ارباب کلیسا کے سامنے اور تو اور، انکے بادشاہوں تک کو دم مارنے کی جا نہیں تھی

مجوسیوں کے ہاں بادشاہ کو "زمین پر خدا کا سایہ" تصور کیا جاتا تھا اور آتشکدوں کے موبد تمام قوم کے اعصاب پر سوار تھے۔ کاشت کار اور محنت کشوں کو انسانوں کی صف میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا ہے اور انہیں یہ کہہ کر مبتلائے فریب رکھا جاتا تھا۔ کہ انسانوں کی یہ تفریق تقسیم خدا کی مقرر کردہ تقدیر کی رُو سے ہوتی ہے۔ جسے بدلنے کا کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ نہ ہی اس کے خلاف لب کشائی کی اجازت۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کی اس زبوں حالی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

بود انسان در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ !

یہ تھی دنیا میں انسان کی حالت، کہ قرآن آیا اور اس نے انقلابی اعلان سے فضائے عالم میں ارتعاش

تکریم آدم پیدا کر دیا کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) یاد رکھو! ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ اس ایک اعلان نے انسان اور انسان کی پیدائشی اور بنیادی تفریق کو ختم کر دیا اور رنگ، نسل، خون، قومیت یا (دوسری طرف) امیر اور غریب گھرانے میں پیدائش کی تمیز کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز۔ پیدائشی تفریق کے مٹا دینے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ وہ جو ایک طرف، بزعم خویش، اونچی ذات یا قبیلہ کا فرد ہونے کے اعتبار سے کبرِ نفس (SUPERIORITY COMPLEX) کا اور دوسری طرف، کمتر درجہ کی ذات کی طرف نسبت سے عمر بھر احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کا مرض دامنگیر رہتا تھا۔ انسان نے اس سے نجات پائی۔ اور دوسری طرف انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے مواقع تمام انسانی بچوں کے لیے یکساں طور پر کھل گئے۔ اور میدانِ عمل میں کسی کے سامنے کوئی پھاٹک نہ رہا کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) جو بھی محنت اور کوشش کرتا ہے۔ ہم اسے آگے بڑھائے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنی بخشائشوں کے راستے میں بند نہیں کھڑے کر دیئے کہ بعض انسانوں کو آگے جانے کی اجازت ہو اور دوسروں کو وہیں روک دیا جائے۔ صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع سب کے لیے یکساں ہیں۔ اور عمل کا میدان ہر ایک کے لیے کشادہ۔ اور اس کے بعد لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ہر ایک کے مدارج اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔

یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا پہلا اصول۔ اس اصول کی رُو سے کسی ایسے نظام کو حق حاصل نہیں کہ وہ مساواتِ محمدیؐ کا نام لے جس میں صورت یہ ہو کہ کوٹھی میں پیدا ہونے والے بچے کو، اس کے یومِ پیدائش سے، زندگی کی تمام آسائشیں اور سہولتیں از خود میسر ہوں۔ آگے بڑھنے کے تمام مواقع اس کے سامنے کھلے ہوں۔ اعلیٰ درجہ کے سکول اور کالج کے داخلہ کے لیے۔ بلند پایہ اساتذہ اور پروفیسروں کی ٹیوشن۔ ولایت تک یونیورسٹیوں تک رسائی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مقابلہ میں ناکام رہے تو مدارج و مراتب کے بڑے سے بڑے مقامات خاندانی وجاہت کے اثرات یا دولت کے بل بوتے پر حاصل کرتا چلا جائے۔ دوسری طرف اسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر (نوکر گھر) میں جنم لینے والا بچہ، دودھ تک سے محروم ہو۔ بڑا ہو تو اوّل تو اسے کسی سکول میں داخلہ ہی نہ ملے۔ داخلہ ملے تو ایسے سکول میں جہاں تعلیم کے بجائے گالیاں اور بدتمیزیاں سکھائی جائیں اور اس کے ساتھ دعوے یہ ہو کہ تعلیم کے دروازے ہر ایک کے لیے یکساں کھلے ہیں۔ اور مقابلہ کے امتحانوں میں ہر طالب علم بیٹھ سکتا ہے۔

کیا اسی کا نام مساوات ہے؟ محمدؐ کی مساوات میں اس عدم مساوات کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اس میں تمام بچے انسانی بچے (بنی آدم) ہوتے ہیں امیروں اور غریبوں کے بچے نہیں

ہوتے۔ پیدا ہوتے وقت کوئی بچہ زر و جواہرات کی تھیلیاں اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ نہ ہی حریر و اطلس کا لباس زیب تن کیے دنیا میں تشریف لاتا ہے۔ سب بچے خالی ہاتھ ننگے بدن، مساوات کا عملی نمونہ بنے دنیا میں آتے ہیں۔ یہ ہمارا باطل نظام ہے جو ان میں پیدائش کی رو سے تفریق و تمیز پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ قرآن کریم نے تمام انسانوں کو بنی آدم کہنے سے رنگ و نسل کے تمام امتیازات ختم کر دیئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یوں تو ساری دنیا میں رنگ و نسل کا امتیاز ایک مسلمہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کی اولین مخاطب قوم (عربوں) میں یہ امتیاز و تفریق انتہائی شدت اختیار کر چکے تھے۔ ان میں نسلی تفاخر اور عصبیت، بنیادی خصوصیت تھی۔ قرآن نے مساواتِ انسانیہ کے اصول کے تحت اس تفاخر اور عصبیت کو ختم کر دیا

نسلی امتیاز

وہ قوم بیشتر بادیہ نشین، خانہ بدوشوں پر مشتمل تھی۔ جن میں وجۂ تعارف کے لیے باقی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ چیز باعثِ عزت و افتخار نہیں ہو سکتی۔ اس نے اعلان کیا کہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اے نوعِ انسان! سن لو کہ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی۔ تمہاری پیدائش مرد اور عورت کے باہمی اختلاط سے ہوتی ہے۔ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اس کے بعد تم جو قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ جاتے ہو۔ تو اسے تعارف کی غرض سے روا رکھا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تمہارے موجودہ نہج زندگی کا تقاضا اور طرز بود و ماند کی عملی ضرورت ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) یہ چیز معیارِ عزت و فضیلت نہیں ہو سکتی۔ تم میں سے جو بھی فرائضِ خداوندی کو بہترین طور پر ادا کرتا ہے، وہی معزز ترین ہے۔ معیارِ عزت جوہرِ ذاتی ہے۔ نہ کہ ذاتیں اور گوئیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعلان حضورؐ نے اپنے آخری حج میں ان الفاظ میں فرمایا کہ:

"اے نوعِ انسان! جان لو کہ تمہارا رب بھی ایک ہے، اور تم اپنی اصل کے اعتبار سے بھی ایک ہی ہو۔ (لہٰذا نسلی امتیاز کوئی شی نہیں) کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں۔ برتری اور فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ (جسے ہر انسان حاصل کر سکتا ہے)"

یہ ہے مساواتِ محمدی کا دوسرا اصول۔ لہٰذا کوئی معاشرہ جس میں ذاتوں اور قومیتوں کا امتیاز ہو اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں باہمی تعارف کے لیے خاندانی یا قبائلی نسبتیں ناگزیر ہوں۔ اب یہ نسبتیں محض بغرض تفاخر قائم رکھی جاتی ہیں۔ سید، افغان، راجپوت، اعوان، بلوچ کہلانے والے ان نسبتوں سے اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اور نچلی ذات والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ خالص ہندو ذہنیت کی تفریق و تخصیص ہے۔ ان تفریقات کی گرہیں اس قدر مضبوط ہیں۔ کہ اونچی ذات والے نیچی ذات والوں کے ساتھ، رشتہ ناطہ تو ایک طرف، معاشرتی روابط بھی روا نہیں رکھتے

چاہتے۔ باقی ذاتیں تو پھر بھی کسی حد تک لچک روا رکھ لیتی ہے۔ لیکن سادات میں، غیر سید کے ساتھ کسی سید زادی کی شادی کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ واضح رہے کہ قرآن و حدیث بلکہ عربی معاشرہ اور زبان میں، سید کا لفظ سردار کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ نسبی نسبت کے لیئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ عرب تو آج بھی اس لفظ کو سردار یا معزز کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ غیر مسلموں کو بھی السید کہہ دیتے ہیں۔ رسول اللہ کی طرف نسبتی نسبت کے لیے اس لفظ کے استعمال کا رواج صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ مساواتِ محمدی پر مبنی نظام میں، ذاتوں اور گوتوں کی یہ تفریق، اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف بغاوت قرار پائے گی۔ اس میں مختلف قومیتوں کا تصور دین کی نقیض ہوگا۔ اس میں سب بنی آدم (انسانوں کے بیٹے) ہوں گے۔ اور مسلم کے نام سے موسوم

اب آگے بڑھیئے۔ انسانوں میں حاکم اور محکوم کی تفریق، یوں نظر آتا ہے۔ جیسے ازل سے چلی آرہی ہے۔ راجوں، مہاراجوں اور شاہوں شاہنشاہوں کو چھوڑیئے۔ انہیں تو منصب خدائی کا حامل سمجھا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھوڑا سا بھی اقتدار آجاتا۔ وہ بھی اپنے آپ کو

حاکم و محکوم

فوق البشر سمجھتے اور دوسرے انسانوں کو اپنا غلام تصور کرتے تھے۔ یہ تفریق ایسا مسلمہ بن چکی تھی۔ یا یوں کہیئے کہ صاحب اقتدار طبقہ نے، جو ہیئتِ حاکمیہ اور مذہبی پیشوائیت پر مشتمل تھا، ایسا سحر پھونک رکھا تھا کہ کسی کے دل میں اس کے خلاف ہلکا سا احساس بھی نہیں ابھرتا تھا اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کسی خاص صاحبِ اقتدار کے خلاف جذبۂ عداوت ابھرتا تو اس سے مقصد صرف اتنا ہوتا کہ اس کی جگہ کوئی اور حاکم لے لے۔ اس نظام کو مٹانے کا خیال کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ سوال اچھے اور برے حاکم کا نہیں۔ وہ نظام یکسر باطل ہے۔ جس میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹)

ترجمہ:۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ــــ خواہ اسے ضابطۂ قوانین حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔

اس ایک اعلان نے ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جن میں مفاد پرست گروہوں نے صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تصور مساواتِ انسانیہ کی نقیض اور شرفِ آدمیت کی تذلیل ہے۔ کہ ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اپنا حاکم سمجھے اور اس کے سامنے جھکے۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ جس کا عملی ذریعہ اس

کے عطا کردہ اصول و اقدار (قرآن مجید) کی تفصیل ہے۔ اس اصول کو ماننے والے، باہمی مشاورت سے ایک ایسی مشینری وضع کرتے ہیں جو ان اصول و اقدار کو معاشرہ میں نافذ کرے۔ ان لوگوں کو دوسرے لوگوں پر کسی قسم کا کوئی تفوق حاصل نہیں ہوتا۔ تفوق اور برتری تو ایک طرف، ان کا کوئی الگ گروہ بھی نہیں ہوتا۔ اربابِ حکومت یا مذہبی پیشواؤں کے الگ گروہ کا وجود یکسر خلافِ اسلام ہے۔ یہ لوگ خدا کے جن احکام کو معاشرہ میں نافذ کریں گے۔ ان کا سب سے پہلے اطلاق خود ان کی اپنی ذات پر بھی ہوگا۔ اس سلسلہ میں اور تو اور خود حضور نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ:۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے میں بھی مامون نہیں رہ سکتا۔ مجھے بھی اس کا خوف ہے۔

اور سربراہ کی بیویوں (ازواج مطہراتؓ) سے کہا گیا کہ اگر تم سے کوئی خلاف قانون حرکت سرزد ہو تو تمہیں دوہری سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰)

یہ مساواتِ محمدیؐ کا تیسرا اصول ہے۔ لہٰذا جس نظام میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہو۔ اس میں مساواتِ محمدیہؐ کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ جمہوری نظام میں کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں بالادستی قانون

جمہوری نظام

کی ہوتی ہے، انسانوں کی نہیں۔ یہ وہ فریب ہے جو نہایت سادگی و پرکاری سے عوام کو دیا جاتا ہے اس میں نظری طور پر کہا جاتا ہے کہ مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ (ساورنٹی) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن عملاً یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جو انتخابات کے ذریعے اکثریت میں آجاتے ہیں۔ انہیں قانون سازی کا بھی حق حاصل ہوتا ہے۔ اور قانون کے اجرا کا بھی۔ سوچیئے کہ جس گروہ کو قانون سازی کا حق حاصل ہو اسے حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے؟ اور یہ حق ایسا مطلق (ABSOLUTE) ہوتا ہے۔ کہ اس کے خلاف کہیں داد فریاد نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ استبدادِ حکومت ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے۔ کہ:۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو۔
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دین کے سیاست سے جدا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قوانین کو نہیں۔ بلکہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو حاصل ہو۔ اس کا نتیجہ ہر حال میں چنگیزیت ہوتا ہے۔ خواہ اس کی شکل (FORM) کوئی سی بھی ہو۔ عام جمہوریت تو ایک طرف اقبالؒ کی نگہ دوررس نے تو یہاں تک بھانپ لیا تھا کہ

نظامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یاد رکھیئے۔ کوئی نظامِ حکومت بھی ہو، جب تک اس میں اقتدار و اصولِ خداوندی کو بالادستی حاصل نہ ہو حاکم و محکوم کی تفریق مٹ نہیں سکتی۔ جس نظام پر غیر متبدل اقدار سماوی کا کنٹرول ہو۔ اسی سے وہ مساوات پیدا ہوتی ہے۔ جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ: ؎

کس درین جا سائل و محروم نیست　　؛　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

جہاں یہ کیفیت نہ ہو، اس کا نتیجہ بہر حال تباہی ہوتا ہے کہ عدالت خداوندی میں، تذلیلِ انسانیت وہ جرمِ عظیم ہے کہ جس کی معافی نہیں۔ ؎

تمیزِ بندہ و آقا، فسادِ آدمیت ہے۔　　؛　　حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

سیرتِ محمدی کے آئینے میں

یہاں تک میں نے، مساواتِ محمدیؐ کی اصولی بحث کی ہے۔ آیئے اب اس مساوات کی جھلک سیرتِ محمدیؐ کے آئینے میں دیکھیں۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس بزرگ و برتر ہستیؐ کی سیرتِ طیبہ کی یہ جھلکیاں ہیں:۔

۱۔ وہ عرب کی ممتاز ترین قوم 'قریش'، کے معزز ترین قبیلۂ بنی ہاشم، کا واحب التکریم فرد ہے۔ لہٰذا اس زمانے کے حسب و نسب کے معیار کی رو سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔

۲۔ وہ خدا کا رسول ہے۔ جس کے ہر حکم کی اطاعت، جماعتِ مومنین کے لئے فریضہ خداوندی ہے۔

۳۔ اور وہ دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا سربراہ بھی ہے۔

دیکھئے کہ اس قدر بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کے بعد، اس علمبردارِ حریت و تکریمِ آدمیت نے مساواتِ انسانیہ کے کس قسم کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کیئے۔ جو واقعات میں پیش کروں گا۔ وہ بظاہر چھوٹے چھوٹے ہیں۔ لیکن اربابِ بصیرت، بالخصوص علمائے نفسیات جانتے ہیں۔ کہ انسان کے صحیح کریکٹر کا اندازہ اس کی روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بہتر طور پر لگ سکتا ہے۔ یہی وہ آنکھ کا تل ہے۔ جس میں آسمان کے ستارے جھلمل جھلمل کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا۔ یا سیدنا۔ (اے ہمارے آقا) اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو۔ تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ، خدا کا عبد اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت (سروری) صرف خدا کی ذات کے لیئے ہے۔

۲۔ ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ تو آپ کے مرتبہ بلند کے احساس سے کانپنے لگا۔

آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی فوق الفطرت ہستی نہیں۔ ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔ جو سوکھا گوشت پکا کر کھاتی تھی۔

۳۔ ایک دفعہ آپؐ تشریف لائے۔ تو صحابہؓ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے۔ ایسا نہ کیا کرو۔ اس کے برعکس حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے، کہ یہ تقاضائے شفقت تھا، تمیز بندہ و آقا نہیں تھی۔

۴۔ قبائل کے نمائندے اور دوسری سلطنتوں کے وفود آتے تو انھیں پہچاننے میں دقت ہوتی کہ اس مملکت کا حکمران کون ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر صحابہؓ نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا کہ آپؐ اس پر بیٹھا کریں۔ آپؐ نے دیکھا تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ چبوترہ کو ٹھوکر مار کر گرا دیا اور فرمایا کہ تم لوگ لگے وہ امتیاز پیدا کرنے جسے مٹانے کے لئے میں آیا ہوں۔ تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے۔ بعد میں آنے والے اسے تختِ حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔

۵۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے دیکھا کہ آپؐ اپنا جوتا مرمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا۔ لائیے جوتا میں گانٹھ دوں۔ ایک تبسم جنت فروش کے ساتھ فرمایا کہ نہ بھائی! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۵) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" خدا کا پیغام ہے۔

۶۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپؐ بھی دیگر رفقاء کے ساتھ مزدوروں کی طرح مٹی ڈھو رہے تھے۔ خندق کھود رہی تھی۔ تو آپؐ بھی دوسروں کے ساتھ کدال چلا رہے تھے۔ دوستوں کی مجلس میں دعوت کا سامان تھا۔ سب نے کام بانٹ لیے آپ نے فرمایا کہ میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے تامل کیا تو فرمایا کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔ غزوہ بدر میں سواری کے جانور کم تھے۔ اس لئے لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ نے بھی اپنی باری مقرر کر رکھی تھی۔ جانثار صحابہؓ اپنی باری حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے۔ تو آپؐ فرماتے کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیدل چل سکتے ہو۔ اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔ مجاہد میدان میں جاتے۔ تو جن کے گھروں میں پیچھے کوئی مرد نہ ہوتا۔ ان کے گھر کے کام آپؐ خود جا کر کر دیتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی لونڈی بھی آپؐ سے کوئی کام کہہ دیتی۔ تو آپؐ اس کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

۷۔ اب آگے بڑھیئے۔ بدر کے قیدیوں کو رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ انہی میں آپؐ کے سن رسیدہ چچا عباسؓ بھی تھے۔ حضورؐ نے ان کے کراہنے کی آواز سنی۔ تو چہرہ غم آلود ہو گیا۔ رفقا بھانپ گئے۔ اور جا کر عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ ان کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی۔ تو آپؐ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ صحابہؓ نے بتایا

تو آپ سخت ناراض ہوئے ۔ فرمایا کہ یا تو سب قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں۔ یا عباسؓ کی رسیاں بھی انہی کی طرح کس دی جائیں ۔ اسی قسم کی تخصیص سے تو انسانیت تباہ ہوتی ہے ۔

۸ ۔ اور وہ واقعہ بھی تو اسی جنگِ بدر کا ہے ۔ جس کے تصوّر سے روح وجد میں آجاتی ہے ۔ جنگ کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابوالعاصؓ بھی تھے ۔ فیصلہ کے مطابق ان قیدیوں کا زرِ فدیہ طلب کیا گیا ۔ تو آپؐ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) نے کانچ کا ایک ہار بطور فدیہ بھیجا ۔ ہار سامنے آیا تو گذشتہ تیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آ گئے ۔ یہ وہ ہار تھا ۔ جسے حضورؐ نے اپنے نکاح پر حضرت خدیجہؓ کو تحفتہً دیا تھا ۔ حضرت خدیجہؓ نے یہی ہار حضرت زینبؓ کی شادی پر الوداعی تحفہ کے طور پر بیٹی کے زیب گلو کیا تھا ۔ کانچ کے اس ہار کی قیمت تو کیا ہو سکتی تھی ۔ لیکن محبت و رفاقت کے مقدس جذبات کی ایک دنیا اس میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی ۔ آپؐ فوج کے "کمانڈر انچیف" بھی تھے ۔ اور سربراہِ مملکت بھی ۔ آپ بلا تامل اس ہار کو باقی ڈھیر سے الگ کر سکتے تھے ۔ لیکن ایسا کرنے سے اصولِ مساوات کو زد پہنچتی ۔ آپؐ نے مجلسِ مشاورت کو بتایا کہ اس ہار کی کیفیت کیا ہے ۔ اور کہا اگر وہ مناسب سمجھیں تو اسے بیٹی کو واپس دے دیا جائے ۔ ان کی تصویب سے ہار واپس کیا گیا ۔ اسوۂ محمدیؐ نے بتایا کہ جب جذبات تقاضائے عدل پر غالب آجائیں تو آبگینہ مساوات چکنا چور ہو جاتا ہے ۔

۹ ۔ اب اس باب میں اس واقعہ کو سامنے لایئے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخر ہے ۔ اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے ۔ وہ واقعہ متعلق ہے ۔ حضرت زیدؓ سے ۔ حضرت زیدؓ ایک غلام تھے ۔ جسے حضورؐ نے آزادی عطا کی تھی ۔ ایک غلام کا آزاد ہونا ہی کچھ کم باعثِ شرف نہ تھا ۔ کہ اس کے بعد آپؐ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا ۔ اور اس کی پرورش خود اپنے گھر میں کی ۔ اس کے بعد اس کی شادی بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون ، اپنی پھوپھی زاد بہن ، حضرت زینبؓ سے کر دی ۔ سوء اتفاق سے وہ شادی کامیاب نہ ہو سکی ۔ اور حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ۔

آپ غور کیجئے کہ حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ آپ پر کس قدر شاق گذرا ہوگا ۔ آپؐ نے اور حضرت زیدؓ سے کہا کہ :-

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ ۔ (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو ۔

غور فرمایئے کہ یہ کہنے والا کون ہے ۔ اور کہا کس سے جا رہا ہے ! کہنے والا خدا کا رسولؐ ہے ۔

...پر ایمان لانے سے (حضرت) زیدؓ مسلمان کہلائے ہیں۔ اور جس کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک تیرے فیصلوں کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں۔ کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو۔ کہنے والا سربراہ مملکت بھی ہے۔ جس کی رعایا میں سے حضرت زیدؓ ہیں۔ کہنے والا وہ محسن ہے۔ جس نے (حضرت) زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔ کہنے والا بمنزلہ باپ کے ہے۔ اور جسے کہا جا رہا ہے وہ بمنزلہ بیٹے کے۔ اور کہنے والا اس معزز خاتون کا برادر بزرگ بھی ہے۔

کہیئے کہ اس کے بعد (حضرت زیدؓ) کو اس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سوچیئے کہ آج اگر پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کا محکوم، کسی باپ کا بیٹا، کسی محسن کا احسان مند، کسی بڑے کا چھوٹا، ایسا کرتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی۔ لیکن وہاں کیا ہوا؟ نہ ماتھے پر شکن آیا۔ نہ زیدؓ پر کوئی عتاب نازل ہوا۔ حتیٰ کے باہمی تعلقات میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہی زیدؓ۔ وہی نبی اکرمؐ۔ اس لئے کہ وہاں تو سکھانا یہ مطلوب تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ کہ دوسرے انسان کو اپنے ذاتی فیصلوں کا پابند بنائے۔ خواہ جذبات کا تقاضہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضورؐ کا یہ حکم نہ بہ حیثیت رسول تھا اور نہ بہ منصب سربراہِ مملکت۔ یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ قرآن نے حضورؐ کی انہی حیثیتوں کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اس واقعہ کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے۔ ضمناً جو لوگ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول وحی پر مبنی ہوتا تھا۔ انھیں سوچنا چاہیئے کہ آپؐ نے جو کچھ حضرت زیدؓ سے کہا تھا وہ اگر حکمِ خداوندی تھا تو کیا اس کی خلاف ورزی سے حضرت زیدؓ (معاذ اللہ) معصیتِ خدا و رسولؐ کے سنگین ترین جرم کے مرتکب ہوئے تھے؟ کیا یہ حضرات ایسا کہنے کے لئے تیار ہیں؟ یہ خدا کا حکم نہیں تھا۔ حضورؐ کا ذاتی مشورہ تھا۔

۱۰۔ یہ تو پھر بھی ایک اصحابیؓ کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں بریرہ نامی ایک لونڈی تھی۔ جو بوجہ آزادی اپنے شوہر (مغیث) سے الگ ہو گئی تھی۔ (حضرت) مغیث کی درخواست پر حضورؐ نے بریرہ سے کہا کہ اپنے شوہر سے الگ نہ ہو۔ ذرا سوچیئے کہ اس لونڈی سے یہ بات کہنے والا کون ہے۔ لیکن وہاں تو حریت و آزادی کی ایسی تعلیم دے رکھی تھی کہ لونڈیوں تک کو اظہارِ خیال اور فیصلہ کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپ ایسا کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حکم تو نہیں۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ پھر معاف فرمایئے۔ میں اس مشورہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ـــ اور حضورؐ ایک تبسّم عاجز نواز کے ساتھ تشریف لے گئے۔

۱۱۔ ان واقعات سے بھی کہیں زیادہ درد انگیز، لیکن بصیرت افروز اس یہودی کا واقعہ ہے۔ جسے حضورؐ نے بہ حیثیت جج، جرم قتل میں موت کی سزا کا حکم سنایا تھا۔ جلاد اس کے سر پر تلوار

لئے کھڑا، آخری اشارے کا منتظر تھا۔ کہ اتنے میں اس یہودی کی ایک خورد سالہ بچی، روتی، چیختی چلاتی دوڑی دوڑی آئی۔ اور حضورؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر التجا کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچایئے۔ اس کی آہ و فغاں اس قدر درد آلود تھی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ حضورؐ قتل کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپؐ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا، اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ کے دریافت کرنے میں حضورؐ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا۔ وہ جذبات اور فریضہ کی ادائیگی کی کشمکش میں ابدی راہ نمائی کا حکم رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُس وقت محمدؐ بن عبد اللہ کی آنکھ روتی تھی۔ اور محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ خدا کا حکم نافذ کر رہا تھا۔

محمدؐ بن عبد اللہ اور محمدؐ رسول اللہ میں یہی وہ نازک فرق تھا جس سے ملحوظ رکھنا، مساوات کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔ یہی وہ فرق تھا۔ جسے حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں ان الفاظ میں واضح کر دیا تھا۔ کہ جب کہا تھا کہ:-

اے پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبرؐ کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکوں گا۔

قانون اور عدل میں رسول اللہؐ کی بیٹی یا سربراہ مملکت کی پھوپھی ہونا بھی کچھ فرق پیدا نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کے رشتہ دار تو ایک طرف خود حضورؐ کی اپنی ذات کے سلسلہ میں بھی نہیں۔ مدینہ میں کسی شخص کی کچھ کھجوریں آپ کے ذمہ قرض تھیں۔ وہ تقاضا کے لئے آیا۔ تو آپؐ نے ایک انصاری سے کھجوریں لے کر اسے واپس کرنا چاہیں۔ اس نے یہ کہہ کر انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ کہ یہ کھجوریں میری کھجوروں سے ناقص ہیں۔ اس انصاری نے اس سے کہا کہ کیا ظلم کر رہے رسولؐ اللہ کی عطا کردہ کھجوروں کو رد کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں عدل کا تقاضہ کر رہا ہوں۔ اگر حضورؐ ہی عدل نہیں کریں گے تو پھر اور کس سے عدل کی توقع کی جائے گی۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ ہاں! یہ سچ کہتا ہے۔ اسے عدل کا تقاضہ کرنے دو۔

ایک طرف مطالبۂ عدل کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف عفو کریمانہ کی یہ کیفیت کہ ایک شخص ہبار بن اسود نے زمانہ ہجرت میں حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو برچھی مار کر زخمی کر دیا تھا۔ جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ اس صدمہ کا حضورؐ کے سینے پر گہرا داغ تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہبار چھپتا پھر رہا تھا اور صحابہؓ اس کی تلاش میں تھے۔ بالآخر اس نے تنگ آ ایک ایسا گوشۂ عافیت تلاش کر لیا۔ جہاں اسے کسی قسم کا خوف نہ تھا اور وہ گوشہ تھا خود حضورؐ رحمتِ دو عالم کا دامن عافیت وہ خود یہ کہتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا کہ: ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

اور عرض کیا کہ مجھ سے عہد جاہلیت میں جو جرم سرزد ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ آپ جو سلوک بھی مجھ سے کرنا چاہیں، اس کے لئے حاضر ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ ایک جنگ میں قبیلہ طے کی ایک لڑکی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہو کر سامنے آئی۔ تو وہ برہنہ سر تھی۔ حضورؐ نے دیکھا تو تلملا کر اُٹھے۔ اِدھر ادھر دیکھا تو کوئی فالتو کپڑا نظر نہ آیا۔ اپنی چادر جو نیچے بچھا رکھی تھی اٹھائی اور نہایت شفقت سے اُسے اوڑھا دی۔ آپؐ اس ردائے مقدس سے اس کا سر ڈھانپ رہے تھے۔ اور فضائے عالم میں یہ نشید جانفزا گونج رہی تھی۔ کہ :-

برتر از گردول مقامِ آدم است اصل تہذیب احترام آدم است

مساوات انسانیہ کا یہی وہ پیغام، اور احترام آدمیت کی یہی وہ تلقین تھی۔ جس کے لئے حضورؐ کی زبان مبارک سے بار بار اعلان کرایا جاتا تھا۔ کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ اور اس اعلان کا عملی مظاہرہ اس انداز سے کیا جاتا کہ کسی کے دل میں حضورؐ کے فوق البشر ہونے کا خیال تک نہ آنے پائے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جس دن آپؐ کے صاحبزادہ (ابراہیم) کا انتقال ہوا۔ اتفاق سے اس روز سورج کو گہن لگ گیا۔ وہ تو خیر پھر بھی عرب کا ملک تھا۔ اور آج سے چودہ سو سال پہلے کا تاریک زمانہ۔ اس قسم کا واقعہ آج بھی کسی "روحانی پیشوا" کے متعلق رونما ہو جائے۔ تو لوگ فوراً اس کے حضور عقیدت مندی کا سر جھکا دیں۔ مختلف قبائل کے لوگ دوڑے دوڑے آئے اور کہا کہ ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہ آپؐ واقعی خدا کے رسولؐ ہیں۔ کیونکہ آپؐ کے غم میں اجرام فلکی بھی سیاہ پوش ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی اور ہوتا تو اس واقعہ اور عوام کے ردِ عمل کو ضرور (EXPLOIT) کر لیتا۔

لیکن آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں یہ خیال آتا ہے۔ میرے شریکِ غم ہونے کی وجہ سے سورج کو گہن لگا ہے۔ تو اسے چاہیئے کہ ایسا خیال دل سے نکال دے۔ چاند اور سورج کو گہن فطرت کے اٹل قوانین کی رُو سے لگتا ہے۔ کسی کے مرنے جینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ اور میری اولاد بھی تمہاری اولاد جیسی ہے۔ اس لئے میرے بیٹے کی وفات کوئی ایسا خلافِ معمول واقعہ نہیں۔ جس پر اجرامِ فلکی ماتم کریں۔ یاد رکھو! اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ؕ

(✲)

یہ ہیں عزیزانِ من! مساواتِ محمدیؐ کی چند جھلکیاں جس نے عملاً بتایا کہ کس طرح تمام انسان، ایک پروردگار کے بندے، ایک اصل کی شاخیں، اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ کس طرح، یہ سب انسان ہونے کی جہت سے یکساں احترام و تکریم کے مستحق ہیں۔

اور ان میں ذاتی جوہر اور حسن و سیرت و کردار کے سوا کوئی معیار تفریق و تخصیص نہیں۔ ان اقدارِ خداوندی کے مظہر، اور سیرت نبویؐ کے آئینہ دار معاشرہ ہی کو مساواتِ محمدیہ کا عکاس کہا جاسکتا ہے جس معاشرہ میں کسی انسان کی عزتِ نفس کو ذرا بھی ٹھیس لگ جائے۔ اسے اپنے آپ کو اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف منسوب کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مساواتِ محمدیؐ کا مقام بڑا دقیع اور رفیع ہے ؎

این گوہر گردان بکابے نفروشند | باخونِ دلِ خویش خریدن وگر آموز

اب آیئے انسان کی طبیعی زندگی کی طرف۔ اسے ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کی طبیعی زندگی مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے انسان کی انسانی زندگی کی نشوونما۔ چونکہ زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کی انسانی زندگی کی نشوونما اس کے طبیعی پیکر کے اندر رہتے

قرآن کا معاشی نظام

ہوئے ہی ممکن ہے، اس لئے اس کی طبیعی زندگی کی پرورش بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے جو معاشی نظام دیا ہے اس میں اس بنیادی حقیقت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ سامانِ زیست ہر فرد معاشرہ کو میسر آجائے۔ لیکن کسی کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج اور دست نگر نہ ہو۔ اگر کسی شخص کو روٹی دے دی جائے۔ لیکن اس کی عزت نفس چھین لی جائے۔ تو قرآن اس قسم کی حیاتِ بے شرف پر مرگِ باشرف کو ہزار بار ترجیح دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ:؎

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

روٹی، کپڑا، مکان بلکہ ہر قسم کی حفاظت، جیلخانے میں حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جیل کی زندگی کو بدترین زندگی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہاں یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ جس معاشی نظام کی بنیاد ایسے فلسفہ پر ہو۔ جس میں انسانی زندگی کو محض طبیعی سمجھا جائے۔ اس میں انسانی اقدار کے تحفظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر اس نظام میں روٹی۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ مہیا بھی ہو جائے۔ تو بھی انسان، حیوانات کی سطح پر رہتا ہے۔ انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس، قرآنی نظام میں میسر آنے والے رزق کو صرف رزق نہیں کہا گیا، اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ "باعزت روٹی"، یعنی وہ سامانِ زیست جس میں

شرفِ انسانیت برقرار رہے۔ ان دونوں نظاموں میں ہی بنیادی فرق ہے۔ جیسے اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ:

آں خدانانے دہد، جانے دہد — ایں خدا نانے دہد، جانے بُرد

اسی بنا پر حضورؐ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ الصدقۃ تمیت القلب۔ خیرات سے انسان کا دل مُردہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام میں، سامانِ زیست مملکت کی طرف سے ملتا ہے، نہ کہ افراد کے ہاتھوں۔ اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کی ضرورت پوری کرے۔ تو وہ نہایت خلوص دل سے اس کی وضاحت کر دے گا کہ: لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُورًا۔ (۷۶/۹) جو کچھ ہم دے رہے ہیں اس کا تم سے معاوضہ لینا تو ایک طرف، ہم اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس معاشرہ میں جو کچھ دوسرں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ:

حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ (۷۰/۲۴-۲۵) یہ ان کا مسلمہ حق ہے جو انہیں دیا جاتا ہے۔

لفظ رزق میں وہ تمام اشیاء آجاتی ہے، جن پر زندگی کا دارومدار اور اس کی نشوونما کا انحصار ہے۔ اس سلسلہ میں مساوات کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ اشیائے زیست میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ضرورت تمام انسانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً روٹی۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ ان اشیا کی ضرورت کے ضمن میں مختلف افراد میں مقدار (QUANTITY) کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا پیٹ دو روٹیوں سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے کی بھوک چار روٹیوں کی ہوتی ہے۔ پست قامت آدمی کو تھوڑے سے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مساوات کا مفہوم

لمبے آدمی کو زیادہ کی۔ مختصر کنبہ کے لئے چھوٹا سا مکان کافی ہو سکتا ہے۔ بڑے کنبے کو وسیع مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تفاوت، مساوات کے خلاف نہیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت، جو اس نظامِ سرمایہ داری کی محافظ ہے۔ جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ مساوات سے مراد، مقدار کی یکسانیت سے کر، قرآنی نظامِ معیشت پیش کرنے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں زمین کی پیداوار کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ۔ (۴۱/۱۰) یعنی زمین کی پیداوار کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے کہ وہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا لیں۔ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے

مضحکہ انگیز تفسیر

ہوئے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصوّرِ اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے نام سے نکالا ہے۔ وہ "سواء للسائلین" کا ترجمہ "سب مانگنے

والوں کیلئے برابر" کرتے ہیں۔ اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں۔ کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لئے برابر خوراک رکھی ہے۔ لہٰذا آیت کا منشاء پورا کرنے کے لئے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے۔ جو سب کو غذا کا مساوی[1] راشن دے۔ کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی۔ جس کا یہ "قرآنی قانون" تقاضہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں۔ جنہیں زندہ رہنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ کیا ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے ۔۔۔۔ پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ سائلین میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں۔ جنہیں انسان پالتا ہے اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمے ہے۔ مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس گھوڑے، خچر، اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے۔ اور اسی قانون کو چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے تو کیا وہ ریاست انسان اور حیوانات کے درمیان معاشی مساوات قائم کرے گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ ص ۴۴-۴۴۳)

اس تفسیر کے متعلق اس سے زیادہ اور عرض کیا جائے کہ خدا اپنی کتابِ عظیم کو اس قسم کے مفسروں سے محفوظ رکھے۔ جنہوں نے اسلام کو اضحوکہ (LAUGHING STOCK) بنا دیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کل کو اگر ان حضرات سے کہا گیا کہ اسلامی نظام عدل کی رو سے قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوتے ہیں۔ تو اس سے یہ مفسّر یہ مراد نہ لے لیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر مجرم کو ایک جیسی سزا ملے گی! اسی قسم کے ہیں وہ مفسّر جن کے متعلق اقبالؒ نے اپنا سر پیٹ کر کہا تھا کہ :۔ ؎

زمن بر صوفی و ملاّ سلامے | کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرائیل و مصطفےٰ را

انہیں کون بتائے کہ رزق کی مساوات سے مفہوم وہ ہے۔ جسے حضور نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ :۔

جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

---

[1] معلوم نہیں ایسا کس نے کہا ہے؟

یعنی اگر سب سیر ہو جائیں۔ اور ایک فرد بھوکا رہے ۔ تو یہ عدم مساوات ہے۔ مساوات یہ ہو گی کہ سب سیر ہو کر سوئیں۔ اور اگر کسی وجہ سے کبھی ایسا ہو کہ سب بھوکے رہ جائیں ، تو وہ بھی مساوات ہو گی ۔ اگر اس میں حیوانات کو بھی شامل کر لیا جائے تو سواءً للسائلین کی تفسیر حضرت عمرؓ کے اس اعلان میں ملے گی ! جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے ۔ تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی

(توفیق الرحمٰن)

قرآنی نظام میں مساوات سے مراد کمیّت (QUANTITY) کی یکسانیت نہیں۔ اس سے

کیفیّت کی یکسانیّت

مراد کیفیت (QUALITY) کی یکسانیت ہے۔ طبیعی زندگی کی یکسانیت کے متعلق اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں ساری حقیقت کو یہ کہہ کر سمو دیا ہے کہ ـــــــ خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست ـــــ طبیعی جسم کی ضروریات بادشاہ اور مزدور دونوں کی ایک جیسی ہوتی ہے ۔ وہ کون سی طب ہے۔ جو یہ کہتی ہے کہ ایک کروڑپتی کے بچے کے ناشتہ میں سیب ۔ بادام ۔مکھن ، بالائی ، انڈے ، طبیعی ضروریات میں سے ، اور مزدور کے بچے کی ضرورت سوکھی روٹی ، بشرطیکہ وہ بھی میسّر آجائے۔ (انفرادی ذوق یا تقاضائے صحت کے لحاظ سے اس میں کچھ تنوع پیدا کر لینا اور بات ہے۔ لیکن معیار سب کا یکساں ہو گا۔) قرآنی نظام میں اس قسم کا تفاوت نہیں ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ عہد فاروقی میں جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار حضرت عقبہ بن فرقد نے وہاں کی ایک خاص مٹھائی کے دو ٹوکرے ، امیر المومنین ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے مٹھائی کو چکھا تو اسے بہت پسند کیا۔ لیکن کھانے سے پہلے ، قاصد سے پوچھا کہ اسے تمام مجاہدین نے کھایا ہے ؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں ! یہ تو صرف آپ کے لئے ہے۔ اس پر عقبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیشِ نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ نے لکھا :۔

اللہ کے بندے ، امیر المؤمنین کی طرف سے عقبہ بن فرقد کے نام :۔

امّا بعد ! فرقد تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو کچھ خدا نے ہمیں عطا کیا ہے ، وہ نہ تمہاری ذاتی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے ۔ نہ تمہارے ماں باپ کی محنت و مشقت کا نتیجہ۔ (یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ محنت کا ثمر ہے ۔) اس لیے ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو ۔ بلاذری ۔ فتوح البلدان)

یہ ہے رزق کی مساوات کا مفہوم ۔ یہی عقبہ جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے ہاں آئے تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جو کی روٹی تھی۔ حضرت عقبہ نے کہا کہ امیر المؤمنین آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں ، گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ نے کہا کہ فرقد ! کیا تمام مملکت

کے افراد کو گیہوں کی روٹی میسّر آ رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسا تو نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ فرقد! عمرؓ کس قدر برا حاکم ہوگا۔ کہ رعایا تو جو کی روٹی کھائے اور عمرؓ گیہوں کی۔ عمرؓ اس دن گیہوں کی روٹی کھائے گا۔ جب تمام افراد مملکت کو گیہوں کی روٹی ملنے لگے گی۔
(طبری۔ عہد فاروقی)

یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا عملی مفہوم۔ اسلامی مملکت میں وسائل کے مطابق، معیارِ زندگی متعین کر لیا جائے گا۔ اور یہ معیار، مملکت کے تمام افراد کا ایک جیسا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آغازِ کار میں اس کا نقشہ وہ ہو جسے حضرت ابو موسےٰ اشعریؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا کسی اور وجہ سے سامان خورد و نوش میں کمی واقعہ ہو جاتی۔ تو یہ لوگ کھانے پینے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔ اور ایک برتن میں حصّے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں۔ اور میں ان میں سے ہوں۔
(صحیحین)

جوں جوں مملکت کے وسائل زیادہ ہوتے جائیں گے۔ یہ معیار بلند تر ہوتا جائے گا۔ حتےٰ کہ یہ اس مقام تک پہنچ جائے گا۔ جسے قرآن نے تمثیلاً جنت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ اس میں شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔ پھلدار درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ پرندوں کا گوشت کھانے کو، عمدہ ترین لباس پہننے کو ہوگا۔ حریر و اطلس کے پردے مخمل اور کمخواب کے صوفے، اور اعلیٰ درجہ کے قالین زینت دہ فرش ہوں گے۔ لیکن یہ سامان تمام اہلِ جنت کو یکساں طور پر میسّر ہوگا۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس میں ایک طبقہ کو یہ کچھ میسّر ہوگا۔ اور دوسرا طبقہ نانِ جویں پر گزارہ کر رہا ہوگا۔ جہاں تک ان کی "انسانی زندگی" کا تعلق ہے۔ اعمال کے مطابق ان کے مدارج میں تفاوت ہوگا۔ لیکن جہاں تک زندگی کی طبیعی ضروریات کا تعلق ہے۔ وہ سب کے لئے یکساں موجود ہوں گی۔
(طبیعی زندگی کی ضروریات میں حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) بھی شامل ہے)۔ یہی وہ اصول ہے۔ جسے حضرتِ صدیق اکبرؓ نے وظائف کے تعیّن کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ آپ نے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق وظیفہ مقرر کیا۔ اس پر بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے اسلام کی زیادہ خدمت کی تھی۔ جنگوں میں زیادہ حصّہ لیا تھا، انھیں زیادہ ملنا چاہیئے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کہ ان لوگوں کو ان کی خدمت کا صلہ خدا کے ہاں سے ملے گا۔ ہم معاشی تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیئے۔ یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا اصول۔

سوشلسٹ طبقہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ مارکس نے ایک ایسا معاشی اصول دیا ہے

جو اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے گا۔ اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے گا۔ انہیں کون بتائے کہ یہ اصول مارکس کا دیا ہوا نہیں۔ محمدؐ رسول اللہ کا عطا کردہ ہے۔ دونوں میں یہ فرق ہے کہ مارکس نے یہ اصول تو بیان کر دیا لیکن یہ نہ بتا سکا کہ اس پر عمل کس طرح سے ہوگا۔ اس سوال نے اسے کس قدر طلسم پیچ و تاب بنا رکھا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اس کی زندگی میں، اس کی اپنی پارٹی کے لوگ جب اس سے یہ سوال کرتے۔ تو وہ جھلا اٹھتا۔ اور انہیں (UTOPIANS) "خوابوں کی دنیا میں بسنے والے" کہہ کر جھٹک دیتا۔ مارکس کے بعد جب لینن سے یہی سوال کیا گیا تو اس نے ہار تھک کر اعتراف کر لیا کہ

نوعِ انسان کن مراحل سے گذر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی۔ اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں۔ نہ جان سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی میٹیریل ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے۔[1]

اس کے برعکس، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے جانشینوں نے عملاً بتا دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس دور میں وظائف کا تعین اس اصول کی عملی تفسیر تھا۔ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا۔ ورنہ میں تفصیل سے بتاتا کہ آج اس اصول پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس اصول کو کوئی ایسا نظام عمل میں نہیں لا سکتا جس میں محنت کا معاوضہ اجرت (WAGES) کی شکل میں ادا کیا جائے۔ حیرت ہے کہ سوشلسٹ حضرات نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت تو اس شد و مد سے کرتے ہیں۔ لیکن اپنے معاشی نظام میں محنت کا معاوضہ اجرتوں کی رو سے متعین کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ اصول نظام سرمایہ داری کی تخلیق ہے۔ ان سے پوچھئے کہ وہ کون سا معیار ہے جس کی رو سے آپ طے کرتے ہیں کہ ایک مزدور کی اجرت پانچ روپے یومیہ ہوگی اور سپرنٹنڈنٹ کی اتنے ہی وقت کی اجرت دس روپے۔ نظام سرمایہ داری تو اس کا جواب نہایت آسانی سے دے دے گا۔ کہ سوال سارا طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا ہے۔ لیکن سوشلزم اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے گی۔ مارکس نے اس کے جواب میں ایک اصول تو بیان کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف کر لیا۔ کہ وہ نہیں جانتا کہ اس پر عمل پیرا کس طرح ہوا جائے گا۔ مساواتِ محمدیؐ نے یہ اصول بھی دیا اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ یعنی ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضرورت کے مطابق مقرر کر دیا۔ اس نظام میں بنیادی ضروریات میں مساوات کی یہ کیفیت ہوگی، البتہ جس شخص کے سپرد جو کام کیا جائے گا اس کی سرانجام

[1] مزید تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھئے۔ میرا مقالہ "اسلامی سوشلزم"

دہی کے لئے اسے جس قدر سامان اور وسائل کی ضرورت ہوگی۔ وہ اسے الگ مہیا کیا جائے گا۔ اس میں فرائض کے لحاظ سے تفاوت ہوگا۔

یہ ہے اسلامی نظام کا اصولی تصوّر۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، نہ ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت ہوں گے۔ نہ وہاں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہوگا۔ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے ارباب شریعت، منبر و محراب سے مساوات محمدیؐ کے وعظ کہتے نہیں تھکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فتویٰ یہ دیتے ہیں۔ کہ اسلام میں ہر شخص، زمین، محلات، جائیداد، روپیہ پیسہ، بے حد و حساب ذاتی ملکیت میں رکھ سکتا ہے۔ وہ اس نظام سرمایہ داری کے تحفظ میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کہ ذاتی جائیداد کی تقدیس ۔۔۔۔۔۔۔ (SANCTIY OF PRIVATE PROPERTY) کو فرمان خداوندی قرار دیتے ہیں۔ ہم ان حضرات سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ

حضورؐ کی زندگی

۱۔ نبی اکرمؐ کی ذاتی ملکیت میں کتنی زمین تھی؟
۲۔ حضورؐ نے کون کون سی جائیدادیں بنائی تھیں؟
۳۔ آپؐ نے کس قدر مال و دولت اپنے ترکہ میں چھوڑا تھا؟

ان سوالات کا جواب، ذاتی جائیداد کی تقدیس کے دعویٰ کی قلعی کھول دے گا۔ اگر وہ ان سوالات کا جواب نہ دینا چاہیں تو ہم ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ کیا وہ ان احادیث کو بھی صحیح مانتے ہیں یا نہیں جن میں کہا گیا کہ

(۱) حضورؐ نے فرمایا کہ میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بچے وہ صدقہ ہوگا۔ (بخاری)

(۲) دوسری روایت میں ہے کہ مرض الموت کے دوران حضورؐ کے ہاں سات دینار تھے اور آپ فرماتے تھے کہ انھیں صدقہ کر دو لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی، اور سب آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو آپؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا۔ جبکہ وہ رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انھیں خود صدقہ کر دیا۔ (یعنی دوسروں کی ضروریات کے لئے بیت المال میں بھیج دیا۔)

(۳) بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیّت کی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم۔ نہ غلام۔ نہ لونڈی۔ اور نہ کوئی اور چیز سوائے ایک خچر اور ہتھیاروں

کے اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔

حضورؐ کے اس عملی نمونہ کے بعد، ذاتی جائیداد کی تقدیس کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے؟

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ اسلامی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس لئے اس میں افراد کے لئے جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ان ضروریات کی مقدار میں تو فرق ہوگا۔ لیکن افراد معاشرہ کے معیار میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ یہ ہے رزق کی مساوات کا صحیح مفہوم۔

لیکن مساواتِ محمدیؐہ صرف رزق کی مساوات کا نام نہیں۔ اس میں رزق کا کریم ہونا بھی ضروری ہے۔ اور رزق کے کریم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرہ میں کسی کی عزتِ نفس کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگے۔ مساواتِ محمدیؐ کی بنیاد شرف و تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ اس کا سرچشمہ قلب و نگاہ کی وہ تبدیلی ہے۔ جو اقدارِ خداوندی پر ایمان اور سیرتِ محمدیؐہ کے اتباع سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے علامہ اقبالؒ نے مارکس کی اشتراکیت اور مساواتِ محمدیؐہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوّت را مقام اندر دل است — بیخ او در دل، نہ در آب و گل است

جس نظام کی بنیاد احترامِ آدمیت پر نہ ہو۔ اس میں مساواتِ محمدیؐ کا نام لینا، اس بلند و بالا اور مقدّس و مطہّر تصوّر کی توہین ہے۔ ذہنِ انسانی کے وضع کردہ نظریات کے ساتھ ان پاکیزہ اصطلاحات کے چسپاں کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دنیا انہی (انسان کے وضع کردہ) نظریات کے عین اسلام اور ماحصلِ نبوتِ محمدیؐہ سمجھ لیتی ہے۔ اور اس طرح محمدیؐ نظریات، آسمان کی بلندیوں سے خاک کی پستیوں میں آگرتے ہیں، اور جب وہ انسانی نظریات جن کے ساتھ ان اصطلاحات کو چسپکا دیا جاتا ہے، ناکام رہ جاتے ہیں۔ تو اپنے اور بیگانے سب اسے خود اسلام کی ناکامی پر محمول کر لیتے ہیں۔ لہٰذا کسی تصوّر، نظریہ یا نظام کو محمدؐ کی طرف منسوب کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ احتیاط جسے، مقامِ محمدیؐ کے شناسا، اقبالؒ نے ان جگر سوز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

چوں بنامِ مصطفٰےؐ خوانم درود — از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ، اے محکومِ غیر — سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو — از درودِ خود میالا نامِ او

آج مساواتِ محمدیؐ کا عکس دنیا کے کسی معاشرہ میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ خدا کرے کہ ہم پاکستان کو ایسا بنا سکیں۔

(والسّلام)

قرآن مجید اور سائنسی تحقیق

قرآن کریم اس منزلِ مقصود کی طرف پہنچنے کے لئے انسان کی راہنمائی کرتا ہے جو کہ خالق کائنات نے اس کے لئے مقرر کی ہے اور جو انسان کی موجودہ طبعی زندگی سے بھی آگے ہے۔ قرآنِ کریم کے اندر انسان کی راہنمائی کے لئے احکامات ہیں قوانین ہیں اور مستقل اقدار ہیں جو قرآن کی تعلیم کی بنیاد ہیں اور جنہیں قرآن کی اصطلاح میں محکمات کہتے ہیں۔ ان محکمات کو سچ ثابت کرنے کے لئے قرآن دو چیزوں کی طرف بار بار اشارے کرتا ہے ایک گذشتہ اقوامِ عالم کی تاریخ جس میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اقوام جو قوانینِ خداوندی پر عمل پیرا رہیں۔ کامیاب و کامران رہیں اور وہ اقوامِ عالم جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے گریز کی راہ نکالی تباہ و برباد ہوتی گئیں۔ قرآن کریم کا دوسرا اشارہ کائنات اور مظاہرِ فطرت کی طرف ہے۔

ازروئے قرآن وہ معاشرتی اصول جو صحت مند انسانی معاشرہ کے قیام کے لئے دیئے گئے ہیں، بنیادی طور پر ان قوانین کے مثیل ہیں جن کی رُو سے نظامِ کائنات چل رہا ہے اور جو ہر سطح پر مادی دنیا کی تنظیم کی بنیاد ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قانون کا سرچشمہ ایک ہی ہے مادی دنیا کے لئے بھی اور انسانی دنیا کے لئے بھی۔ قرآن کریم کی ان آیات کے متعلق جن میں اقوامِ سابقہ کی سرگذشت ہے ہمارے علمائے دین بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں مزید تحقیق کا دائرہ بھی محدود ہے لیکن میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ وہ آیات جن کا اشارہ کائنات کی طرف ہے ان کی تفاسیر عام طور پر غیر مکمل ہیں اس لئے کہ ہمارے مفسرین سائنسی علوم سے کم واقفیت رکھتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ جوں جوں وقت گذرنے کے ساتھ سائنس کی تحقیق آگے بڑھتی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کے مطالب اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ ایک اور بات جو میرے مشاہدے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کائنات کے متعلق کچھ ایسے نکات بھی آئے ہیں جنہیں سائنسی تحقیق نے گذشتہ تین صدیوں کے دوران بلکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں گذشتہ نصف صدی کے دوران دریافت کیا ہے لیکن قرآنِ کریم ان کے

متعلق آج سے چودہ صدیاں پہلے اشارے کر گیا ہے بلکہ بعض دلچسپ موضوع ایسے بھی ہیں جن تک سائنس کی تحقیق ابھی تک نہیں پہنچ سکی، گو کوشش جاری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے کہ زمین کے علاوہ دیگر اجرام فلکی میں بھی زندگی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم ان مخلوق کو جمع کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ (۴۲:۲۹) (سورۃ شوریٰ)

دساتیر فطرت کی طرف یہ اشارات اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ قرآن کریم حضور نبی اکرمؐ پر وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔ وما کنت تتلو من قبلہ من کتب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون (۲۹:۴۸) "(ہر شخص جانتا ہے کہ) اس قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے لکھ سکتا تھا (سورہ عنکبوت) اگر تو نزول قرآن سے پہلے لکھنا پڑھنا جانتا تو ان ان لوگوں کو جو اسے باطل قرار دے رہے ہیں شک گزر سکتا تھا کہ تم نے اسے خود ہی وضع کر لیا ہے۔

قرآن کا استدلال ہے کہ وحی ملنے سے پہلے حضور نبی اکرمؐ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اگر وہ ایسا کر سکتے تو مخالفین یہ کہہ سکتے تھے کہ قرآن وحی کے ذریعے نازل نہیں ہوا بلکہ حضورؐ کی اپنی ایجاد ہے، لیکن میں جو کچھ آگے لکھنے والا ہوں مجھے اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر حضورؐ میں وحی کے نزول سے پیشتر لکھنے پڑھنے کی استعداد موجود بھی ہوتی تو بھی یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص اس زمانے کے دنیوی علوم کی سطح پر انحصار کرتے ہوئے کائنات کے متعلق وہ اشارے کر سکتا جو اس میں چودہ صدیوں سے موجود ہیں اور جنہیں سائنس کی تحقیق نے آج دریافت کیا ہے۔ قرآن کریم کے اندر ۲۵۰ کے قریب ایسی آیات ہیں جو قانون سازی کے متعلق ہیں۔ اس کے مقابلے میں ۷۵۰ کے قریب آیات مظاہر فطرت کے متعلق ہیں، _____ قرآن مظاہر فطرت کے متعلق تحقیق پر بار بار زور دیتا ہے اور کہتا ہے۔ وفی الارض ایٰت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون (۵۱:۲۰:۲۱)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قوت اور علم کا ادراک اتنا ہی زیادہ ہوتا جائے گا جتنا کہ کوئی مظاہر فطرت پر غور کرے گویا مظاہر فطرت کا علم حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کو پہچاننا ہے اور مظاہر فطرت پر تحقیق اور حصول علم کے بعد قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اپنی کوششوں کے ماحصل کو کس طریق سے استعمال کرنا ہے۔ چنانچہ علوم سائنس کا حصول اور وحی کی روشنی دو ایسے پہیے ہیں جن کے سہارے زندگی کی گاڑی آگے چلتی ہے۔ ان دونوں پہیوں میں سے کوئی ایک موجود نہ ہو تو گاڑی آگے چلنے سے رک جاتی ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے سائنس کا علم حاصل کیا لیکن وحی کی روشنی سے محروم ہیں، آج بھی زندگی کی شاہراہ پر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ انکی مثال

ایسی ہے جیسے کسی کارواں کے پاس بے حد قیمتی سامان موجود ہو لیکن زندگی کے دوراہوں پر انہیں کوئی نشان راہ نظر نہ آئے جس پر لکھا ہو کہ یہ راستہ کس طرف کو جاتا ہے۔ دوسری طرف مسلمان قوم (بلکہ قومیں) وہ ہیں جو سائنس کے علوم سے بے بہرہ ہیں۔ انکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اندھا ہاتھ میں مشعل لئے پھر رہا ہو۔ قرآن تسخیر کائنات پر بے حد زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

۱۔ وہ لوگ جو اپنے کان آنکھ اور عقل کو استعمال کرکے مظاہر فطرت کا علم حاصل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس علم کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ مومن اور متقی ہیں ان کا حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔

۲۔ وہ لوگ جو کائنات کو تو مسخر کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح حاصل کئے ہوئے سائنسی علوم کو انسانیت کی بہبود کے لئے استعمال نہیں کرتے وہ مقام آدم تک تو پہنچ جاتے ہیں اور اس دنیا کی شان و شوکت سے بھی ہمکنار ہو سکتے ہیں لیکن ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں۔

۳۔ اور وہ لوگ جو تسخیر کائنات کی طرف سرے سے رجوع ہی نہیں کرتے وہ مقام آدم تک بھی نہیں پہنچتے کیونکہ مقام آدم وہ ہے جہاں کائناتی قوتیں انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کا حال بھی تاریک ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

تخلیق کائنات اور قرآن

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ..... (۶:۱)

ارض و سموٰت کا گوشہ گوشہ اپنے خالق کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے۔ اس میں تاریکی اجالے کی نمود اس کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے کرّے اور کرۂ ارض پر زندگی کے ان گنت نمونے اتنے خوبصورت اور پرکشش ہیں کہ جو کوئی بھی اپنی عقل و بصیرت کو استعمال کرتا ہے۔ بے اختیار الحمد للہ پکار اٹھتا ہے

قانون تخلیق قرآن کریم اللہ کو فاطر السمٰوٰت والارض کہتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اللہ نے زمین و آسمان کو اوّل مرتبہ اس وقت تخلیق کیا جب کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ فطرت (مادہ۔ ف ط ر) یوں تو اس کے معنی شق کر دینا اور پھاڑ دینا ہے لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کام کو پہلے مرتبہ کیا جائے۔ اسی اعتبار سے اللہ کو فاطر السمٰوٰت والارض کہا گیا۔ یعنی وہ جس نے کائنات کو پہلی مرتبہ بنایا یعنی اسے عدم سے وجود میں لایا۔ اسی کو دوسری جگہ بدیع السمٰوات والارض کہا گیا ہے۔ (۶:۱۰۲)

چنانچہ فطرت اللہ کے معنی ہوں گے خدا کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق وہ اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جس کی رُو سے اس نے انہیں تخلیق کیا۔ لیکن ہمارے ہاں فطرت کا لفظ نیچر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور نیچر سے مراد ہوتی ہے وہ خصوصیت جو اٹل ہو جو غیر متبدل ہو۔ یعنی ایسی خصوصیت جس سے اس کا تشخص وابستہ ہو مثلاً آگ کی فطرت حرارت پہنچانا ہے اگر وہ حرارت نہیں پہنچاتی تو وہ آگ نہیں۔ اسی طرح بشر کی فطرت درندگی ہے وہ گوشت کھائے گا گھاس کبھی نہیں کھائے گا اور بکری کی فطرت چرندگی ہے وہ گھاس چرے گی گوشت کبھی نہیں کھائے گی۔ اس سے واضح ہے کہ کوئی چیز اپنی فطرت نہیں بدل سکتی۔ لہٰذا فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو اس کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ ان معنوں میں نہ خدا کی کوئی فطرت ہو سکتی ہے اور نہ انسان کی البتہ خدا نے جو قوانین بنائے ہیں ان کو فطرت اللہ کہا جا سکتا ہے۔ انہی کو سنت اللہ بھی کہتے ہیں۔ اور کلمۃ اللہ بھی۔ جب یہ قوانین فارمولا کی شکل میں ہوں تو انہیں کلمۃ اللہ کہا جائے گا اور جب وہ عملی شکل اختیار کر لیں تو انہیں سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ خارجی کائنات کے متعلق قوانین کو قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے اور انہیں انسانی علم و تحقیق کے ذریعے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ تسخیر ارض و سمٰوٰت سے مراد یہ ہے کہ سلسلۂ کائنات ان قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جنہیں انسان اپنی سعی و کاوش کے ذریعے دریافت کر سکتا ہے۔ جب اس قانون کو دریافت کر لیا جائے جس کے تابع کوئی شے سرگرمِ عمل ہے تو وہ شے خود انسان کے لئے مسخر ہو جاتی ہے۔ لیکن انسانی دنیا کے لئے قوانین، وحی کے ذریعے انبیائے کرام کی وساطت سے ملتے تھے اور اب وہ قرآن کے اندر محفوظ ہیں جب ان قوانین کو سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے تو اس سے انسان خود اپنے آپ کو مسخر کر لیتا ہے اسی کو ضبطِ خویش کہا جاتا ہے جو انسانی ترقی کا سنگِ بنیاد ہے۔

تخلیق کے مراحل

قرآن کہتا ہے بدیع السمٰوٰت والارض واذا قضیٰ امرًا فانما یقول لہ کن فیکون (۲:۱۱۷) وہ خدا جو پہلی مرتبہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس کا انداز تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پھر کہا: اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۳۶ : ۲) اس کا قانونِ تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادہ کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا ارادہ اور فیصلہ اس کے قانونِ تخلیق کا حصہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے تخلیق کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں جو کہ درحقیقت تخلیق کے دو مراحل ہیں، ایک امر اور دوسرا خلق،

خلق اسے کہتے ہیں جب موجود اشیاء کو ملا کر ان سے ایک نئی شے معرضِ وجود میں لائی جاتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں ایک شے مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں وہ شے ابھی مشہود شکل میں نہیں ہوتی بلکہ مراحلِ تکوین میں ہوتی ہے یعنی اس کا ابھی خاکہ تیار ہو رہا ہوتا ہے۔ اس منصوبہ بندی کے مرحلے کو قرآن عالمِ امر کہتا ہے۔ اس منصوبہ بندی کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طریق سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ انسان کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے۔ اسی چیز کو قرآن دیگر مقامات پر مشیت کہہ کر پکارتا ہے: یفعل اللہ ما یشاء (۱۴:۲۷) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اللہ کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ وہ ایک خود مختار بادشاہ ہے جو جی میں آئے اپنی مرضی کے مطابق کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک غلط تصور ہے۔ یفعل اللہ ما یشاء کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مشیت کے معنی توہمات و خواہشات نہیں، اس کے معنی قوانین ہیں۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (۲۱:۲۳) وہ جو کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہوگی، یعنی کوئی اللہ سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے اس سلسلہ کائنات کو ایسا کیوں بنایا ہے؟ اور اس کے لئے کیوں اس قسم کے قوانین نافذ کئے ہیں؟ مثال کے طور پر آگ کو یہ کام سونپ دیا کہ وہ جلائے گی۔ پانی ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف بہے گا۔ درخت کا پھل گرے گا تو زمین کی طرف آئے گا اوپر کو نہیں چڑھے گا۔ اس کے متعلق کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ طبیعی قوانین اشیائے کائنات کو عالمِ امر میں سونپ دیئے گئے ہیں۔ لفظ "امر" سے مراد رہنمائی یا حکماً راہنمائی ہے۔ چنانچہ وہ قوانین جو کائنات میں کارفرما ہیں انکو امر بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ (۷:۵۴) سورج، چاند اور (باقی) آسمانی کرّے اس کے امر (متعین کردہ قوانین) کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔

پیمانے ان قوانین کو بروئے کار لانے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے گئے ہیں چنانچہ کہا گیا وکان امر اللہ قدرا مقدورا (۳۳:۳۸) "اللہ کا قانون اس کی مشیت کی رُو سے مقرر شدہ پیمانوں کے اندر بنتا ہے"۔ پھر کہا قد جعل اللہ لکل شئ قدرا (۶۵:۳) "اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے"۔ چنانچہ آم کی گٹھلی سے صرف آم کا درخت پیدا ہوگا۔ کوئی اور شے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی اسکی تقدیر ہے۔ چنانچہ قوانینِ خداوندی کے آغاز کے ساتھ ان کو بروئے کار لانے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے گئے جوں جوں ہم کائنات کو مسخر کرتے جاتے ہیں یہ قوانین اور ان کو بروئے کار لانے کی عملی شکلیں سامنے آتی جاتی ہے۔ لیکن انسان کے علم کی حد یہ ہے کہ ہم جان سکتے ہیں کہ

یہ قوانین کس طرح کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

قوانین خداوندی کی دوسری قسم جو انسانی دنیا میں انسان کی رہنمائی کے لئے انبیائے کرام کی وساطت سے وحی کے ذریعے ملے ہیں۔ ان کے متعلق انسان کو اختیار ارادہ دے دیا گیا ہے چاہے ان کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے۔ اگر انسان کے اعمال ان قوانین کے مطابق ہونگے تو یہ اس کی ذات کی نشوونما اور بقا کا ذریعہ بنتے جائیں گے اور اگر اعمال انسانی ان قوانین کے خلاف ہوں گے تو یہ انسانی ذات کی فنا کا سبب بنتے جائیں گے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱: ۱-۱۰) سورج اور اس کی خیا باریاں۔ چاند اور اس کی روشنی مستعار لینے کے لئے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنا۔ دن اور اس کی جلوہ فروشیاں۔ رات اور اس کی تاریکیاں جو ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ فضا کی بلندیوں میں اجرام فلکی اور جس طریق سے ان کو بنایا گیا ہے۔ زمین اور اس کا (گول ہونے کے باوجود) اس طرح پھیلا ہوا اور کشادہ ہونا۔ (اور خارجی کائنات سے نیچے اتر کر خود انسانی ذات اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے۔ پھر اس کے اندر جس انداز سے اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو (غلط روش پر چل کر) اپنے اندر انتشار پیدا کرلے اور چاہے تو اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم تر ہوتی جائے۔ انفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام پروگرام اس بات کا شاہد ہے کہ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشتِ حیات ویراں ہو گئی اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں۔

قوانین خداوندی غیر متبدل ہیں

ہر دو قسم کے قوانین یعنی وہ طبیعی قوانین جو ارض و سماوات میں کارفرما ہیں اور وہ جو انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے دیئے گئے ہیں۔ اٹل اور غیر متبدل ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ... (۶: ۳۴) اللہ کا قانون اٹل ہے اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ... (۳: ۱۲۷) (اے رسول تجھے اللہ کے قانون کے بدلنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ ان مخالفین میں سے کون کون اپنی سرکشی کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا اور کسے (سرزنش کے بعد) معاف کر دیا جائے گا۔ اس کا فیصلہ (تیرے (یا کسی انسان کے ذاتی طور پر) کرنے کا نہیں یہ فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق کیا جائے گا)

.... لا تبدیل لخلق اللہ... (۳۰ : ۳۰) اللہ کے قانونِ تخلیق کو بدلا نہیں جا سکتا۔
.... لا تجد لسنتنا تحویلا (۱۷ : ۷۷) اے رسولؐ! ہمارے قوانین اور دستور اٹل ہوتے ہیں۔ تو ان میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔
فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا: (۳۵ : ۴۳) خدا کا قانون اٹل ہے اس میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے (نہ اس کی نتیجہ خیزی میں کوئی تبدیلی ہوا کرتی ہے اور نہ اس کے نتائج کی سمت بدلا کرتی ہے، کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی)۔

اللہ کی تخلیق بے داغ اور مکمل ہے

الذی خلق سبع سموات طباقا ما ترٰی فی خلق الرحمٰن من تفوت۔
فارجع البصر ھل ترٰی من فطور۔ ثم ارجع البصر کرتین
ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر (۶۷ : ۳-۴)
(اگر تم دیکھنا چاہو کہ اس کا پروگرام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کی صفات رحمت و قدرت کس حسن و خوبی سے بیک وقت کارفرما ہیں تو کائنات کی اس عظیم مشینری پر غور کرو)
اس نے فضا کی پہنائیوں میں مختلف کرّوں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں (ان میں باہمی تصادم نہیں ہوتا) تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ تمہیں خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی نظر نہیں آئے گی کہیں عدم تناسب نظر نہیں آئے گا۔ تم ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ کو لوٹا کر دیکھو خوب جانچ پڑتال کر کے غور کرو تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا درز دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی شے بے جوڑ یا نامکمل نہیں ہو گی۔ تم دوبارہ (سہ بارہ) نظر کو لوٹا کر دیکھو۔ تمہاری نگاہ ہر بار تمہارے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔ اسے کہیں کوئی اختلال یا فطور نظر نہیں آئے گا۔

(ڈاکٹر سید عبدالودود)
۳۲۔ نسبت روڈ لاہور

پرچہ کی ترسیل کے متعلق خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں
جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے
(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

نقد و نظر

نام کتاب :- الٰہیات انقلاب
مصنف :- مولانا الطاف جاوید
شائع کردہ :- ادارہ تعبیر نو B-۷۴ گلبرگ لاہور
صفحات :- ۹۶ - قیمت درج نہیں

اس وقت دنیا میں دو نظاموں کا سکہ چل رہا ہے۔ ایک سرمایہ داری نظام اور دوسرا سوشلزم۔ یہ نظام معاشی بھی ہیں اور سیاسی بھی، کیونکہ کسی ملک کی سیاست پر گفتگو انہی نظاموں کی روشنی میں ہی کی جاتی ہے۔ سرمایہ داری نظام زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں جو لوگ محنت کرتے ہیں، ان کی محنت کا ثمرہ کچھ دوسرے لوگ لے جاتے ہیں، جو اس محنت کے عمل میں شریک نہیں ہوتے۔ اس نظام نے اپنے آپ کو جائز ثابت کرنے کیلئے مذہبی پیشوائیت کا سہارا لیا کیونکہ عامتہ الناس کو ہر دور میں مذہب سے قربی لگاؤ رہا ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم کا نعرہ یہ ہے، کہ سرمایہ داری نظام، محنت کشوں کی محنت کے استحصال پر قائم ہے اس لئے اسے ختم ہو جانا چاہیئے اور ہر محنت کش کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملنا چاہیئے۔ سرمایہ داری نظام کے داعیوں نے اپنے آپ کو سوشلزم کی یلغار سے بچانے کے لئے، ایک دفعہ پھر مذہبی طبقے کی حمایت حاصل کی جس کی سوشلزم کے علمبرداروں نے سخت مخالفت کی۔ سرمایہ داری نظام کے داعیوں نے اس صورتِ حالات کا پورا فائدہ اٹھایا اور عامتہ الناس کے دلوں میں یہ بات پختہ کر دی کہ سوشلزم، مذہب کا مخالف ہے۔ اور اس سلسلے میں ایسا منظم اور زوردار پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود سوشلزم کا نعرہ لگانے والے کچھ ناپختہ ذہن بھی اس کا شکار ہو گئے اور انہوں نے بھی یہ فرض کر لیا کہ سوشلزم واقعی مذہب کا دشمن ہے اور اسی بنیاد پر وہ بھی مذہب کی مخالفت کرنے لگے۔ کتاب زیر تبصرہ کے مصنف مولانا الطاف جاوید صاحب نے اس غلط فہمی کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد ہیں اور ملک میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے خواہشمند ہیں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب تک اسلامی انقلاب کے ڈانڈے معاشی انقلاب کے ساتھ

نہیں ملائے جاتے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے اسلام اور سوشلزم دونوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سوشلزم حقیقی مذہب کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ سوشلزم کے داعیوں نے جس مذہب کی مخالفت کی تھی وہ اس کی وہ بگڑی ہوئی شکل تھی، جو مذہبی پیشوائیت نے، اپنے مفاد کی خاطر اُسے مسخ کر کے پیش کی تھی۔

جہاں تک حقیقی مذہب کا تعلق ہے جو انبیاء اور حکماء الٰہی کے ذریعے انسانیت تک پہنچا، وہ اس کے مخالف نہ تھے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار اب اس حقیقت کو سمجھتے جا رہے ہیں، ان کے خیال کے مطابق اس کا پہلا مظہر ایران کے مجاہدین نطق ہیں۔ ان کے بعد اس تفہیم کا نور نکاراگوا اور السلواڈور جیسے ممالک کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسیحی پادریوں ویٹ نام کے بدھ راہنماؤں اور دوسرے مذاہب کے دانشوروں میں پھیلتا جا رہا ہے (ص ۳) پاکستانی اہلِ علم کو بھی اس بدلتی ہوئی صورتِ حالات کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے، تاکہ ملک میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو سکے۔

ہمارے خیال کے مطابق کتاب علمی ہے اور ہر صاحبِ علم کو اس کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

۲۔ نام کتاب :۔ Gateway To the QURAN
نام مصنف :۔ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب
شائع کردہ :۔ خالد پبلشرز۔ ۳۲۔ نسبت روڈ لاہور
صفحات :۔ ۱۲۴۔ قیمت ۔/۴۸ روپے

کتاب زیرِ تبصرہ سورۃ فاتحہ کی جدید سائنسی علوم کی روشنی میں ایک نئی تفسیر ہے جو مصنف نے علامہ پرویز صاحب کی قرآنی فکر سے متاثر ہو کر لکھی ہے، اس کی صحیح قدر و قیمت جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کی پہلے سے موجود تفاسیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

مختلف زمانوں میں قرآنِ مجید کی سینکڑوں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں۔ ہر دور کے علماء نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے دور کی علمی تحقیقات کی روشنی میں قرآنِ مجید کی تعلیمات کو پیش کریں لیکن حیرت کی بات ہے کہ موجودہ دور کہ جسے سائنسی تحقیقات کا دور کہا جاتا ہے۔ میں تفسیر پر کام کرنے والے علماء بالعموم اس امر کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے سے قاصر رہے۔ حالانکہ نئی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں، قرآنی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے سینکڑوں آیات میں مظاہرِ قدرت، جو سائنس کا

(اس کا باقی حصہ صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

دین کی باتیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

جناب پرویز علیہ الرحمۃ کی بصیرت فرقانی کے کچھ اور نقوشِ تابندہ قارئینِ طلوع اسلام کے لئے پیش کرتی ہوں۔

۱۔ وحی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ عقل کے لئے حدود مقرر کر دے اور عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جذبات کو اپنے تابع رکھے۔

۲۔ عقل فریب کار کے تراشیدہ پردے خدا کی بارہ گاہ میں نہیں ڈالے جا سکتے۔

۳۔ شرّ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان محض بھوک کی خاطر دنیا میں قیدی بن کے رہ جائے۔

۴۔ جس نظام کے اندر طبقات اور مختلف جماعتیں بنتی ہیں، وہ ابلیسی نظام ہے۔ حق کا اس سے واسطہ نہیں۔

۵۔ اس بات کا فیصلہ یہیں ہوتا ہے کہ انسان جنّت میں جانے کے قابل ہوا یا نہیں جس نے اپنی صلاحیت اس طرح نہیں بڑھائی کہ وہ جنّت کا حقدار بن سکے تو پھر وہ کبھی جنت نہیں پا سکے گا۔

۶۔ انسان کے اعمال کے نقوش اس کی ذات پر نقش ہو جاتے ہیں اور اس کی ذات ان نقوش کے ساتھ آگے چلی جاتی ہے۔

۷۔ فرد ہو یا قوم جو ہر سانس پہ اپنا محاسبہ نہیں کرتی وہ کبھی تباہی سے بچ نہیں سکتی۔

۸۔ آگے بڑھنے کی ہوس رکھنے والو! اس میں آگے بڑھو کہ دوسروں کے لئے کون کتنا زیادہ دیتا ہے۔

۹۔ جس پہ ظلم ہوتا ہے وہ انتظار نہیں کرنا چاہتا۔

۱۰۔ قرآن انکی سمجھ میں آتا ہے، جو عقل و بصیرت سے اس پہ غور کرتے ہیں۔

۱۱۔ قرآن کی قرأت اس لئے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

۱۲۔ صحیح رہنمائی کے لئے پہلی شرط تجسّس ہے۔ خلش ہے، سوز ہے، گداز ہے۔ حاضر و موجود سے بیزاری ہے۔ اور یہی لا الٰہ الا اللہ ہے۔ حاضر و موجود کے معبودوں سے بیزار ہوتے

بغیر مجبورِ حقیقی نہیں مل سکتا۔
۱۳۔ جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں ایک ثانیہ کی بھی توسیع نہیں ہو سکتی۔
۱۴۔ زندگی کے ہر سانس اور ہر قدم پہ مصلّی رہنا مسلمان کا طریقہ ہے۔
۱۵۔ تمہاری ذات کو اس قدر مستحکم ہونا چاہیئے کہ موت کا دھچکہ بھی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔
۱۶۔ قرآن نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کو کچھ اس طرح سمجھو کہ گویا ایک خشک دانہ ہے۔ لیکن اس کے اندر زندگی کے امکانات اس طرح پوشیدہ ہیں کہ ہمارے قانون کے ایک چھینٹے سے یہ سوئے ہوئے، گویا آنکھیں ملتے ہوئے، اٹھ کھڑے ہوں گے۔
۱۷۔ اس دنیا میں محکوم و شکست خوردہ قوموں کا زمانے کے تقاضوں کے مطابق یک لخت کھڑے ہو جانا۔ قرآن نے اسے بھی قیامت سے تعبیر کیا ہے۔
۱۸۔ آخرت انسانی تمناؤں کی تکمیل کے لئے اگلی سٹیج کا نام ہے۔ وہ جس کا تصوّر ہم اپنی موجودہ ذہنی سطح پہ نہیں کر سکتے۔
۱۹۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ایسے عظیم القدر انقلاب کا پیغام لے کر آئے۔ تھے جس کا منشاء و مقصود یہ تھا کہ بحر و بر کے فساد کی اصلاح ہو جائے۔
۲۰۔ ساتھیوں کے بغیر کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔
۲۱۔ نوعِ انسان کو ایک درخت کی طرح ہونا چاہیئے۔ شاخیں بکھری بکھری، پتّے جدا جدا، لیکن جڑ ایک۔ اگر وہ قائم ہے تو ایک ایک پتّی سرسبز رہے گی۔
۲۲۔ اگر کسی معاشرے کی اخلاقی خرابیاں دُور ہو جائیں تو جتنی خرابیاں طبعی زندگی کی ہوتی ہیں۔ سب کی سب دُور ہو جاتی ہیں۔
۲۳۔ جہاں بھی بے انصافی ہو گی۔ وہاں تباہی کا جہنّم آ کر رہے گا۔
۲۴۔ جسے ہر وقت اس کا احساس ہے کہ میرا ایک ایک عمل ہی نہیں۔ دل کے اندر آنے والے ارادے و خیال کا بھی حساب دینا ہے۔ کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔
۲۵۔ کارواں کے لئے امیر کارواں کی ذمّہ داریاں بڑی عظیم ہوتی ہیں۔
۲۶۔ قرآن کی علم کی شمع کی موجودگی میں جہالت آمیز باتوں کی گنجائش رہ نہیں سکتی۔
۲۷۔ حق کی آواز اگر کان کھول کر سنی جائے تو دنیا کی کوئی پکار اس سے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتی۔
۲۸۔ مفاد کے اشتراک سے دل کا تپاک پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تپاک ایمان کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے۔
۲۹۔ دوسروں کو اس خیال سے نہ دو کہ اس سے زیادہ کی خواہش تم رکھو۔
۳۰۔ جو اپنا اخلاق خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا اخلاق خراب نہیں ہوتا۔
۳۱۔ مادی ذرائع کو اس طرح استعمال کرو جس طرح کسان مٹی کو بیج کیلئے استعمال کرتا ہے۔

۳۰۔ قانون وہ قانون ہے جو خارجی ماحول سے متاثر نہ ہو۔ انسان کے جذبات کو بہت سی چیزیں متاثر کرتی ہیں۔ لیکن قانون اس سے بلند چیز ہے۔

۳۳۔ قانون پر یقین رکھنے والا اپنی قسمت کا حال دوسرے سے نہیں پوچھتا۔ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔ اپنا ہاتھ دوسروں کو نہیں دکھاتا۔ بلکہ خود دیکھتا ہے۔

۳۴۔ انسان اور حیوان میں دوسرا بڑا فرق حفاظتِ عصمت ہے۔

۳۵۔ رات کی تاریکیوں سے گھبرانے والے صبح کی روشنی پر نگاہ رکھ۔ ہو نہیں سکتا کہ اس کے بعد نمودِ سحر نہ ہو۔

۳۶۔ خدا کی صفتِ ربوبیت کی کبریائی عالمِ انسانیت میں ہونی چاہیئے۔

۳۷۔ جو ہماری نگاہوں کے سامنے مرجاتے ہیں۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہم مرجاتے ہیں۔ وہ تو زندہ رہتے ہیں کیونکہ زندگی تو تسلسل کا نام ہے۔

۳۸۔ سلسلۂ ارتقا، کی رُو سے یہ زندگی جو کروڑ در کروڑ مراحل طے کر کے ذاتِ انسانی تک پہنچی ہے۔ اس لئے نہیں پہنچی کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد یہاں پہنچ کر یہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔

۳۹۔ جو راستہ تم نے اختیار کرنا ہے کرو۔ اس کا تمہیں اختیار ہے۔ لیکن جب اس کے نتائج سامنے آئیں گے اس وقت تمہیں کسی معذرت کا اختیار نہیں ہوگا۔

۴۰۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا معیار یہ ہے کہ مومنین کو اس دنیا میں کہیں ذلت دیکھنی نصیب نہ ہو۔

۴۱۔ جو زبان خدا کے فرمان کی متحمل ہو سکے۔ سوچ لیجئے وہ زبان کیا ہوگی؟

۴۲۔ قرآن کی ساری تعلیم اس نقطہ کے گرد گھومتی ہے کہ انسان صاحبِ اختیار ہے۔ اس لئے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

۴۳۔ پھٹے ہوئے گریبان کی اس طرح رفوگری کرنا کہ معلوم نہ ہو کہ وہ سیا ہوا ہے اور اسطرح سیا ہو کہ پھر نہ پھٹے، اسے نصیحت کہتے ہیں۔

۴۴۔ موت کے وقت کا علم نہ ہونے کی لم یہ ہے کہ جو بھی تم اچھا کام کر سکتے ہو کر لو۔ اب کر لو۔ کیا معلوم اگلا سانس بھی تمہیں ملے یا نہیں۔

۴۵۔ ملوکیت و سرمایہ داری تو جڑ داں بچے ہوتے ہیں جو مذہبی پیشوائیت کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ فرعون کو ہامان کا سہارا چاہیئے۔

۴۶۔ وہ معاشرہ جس میں خدا کے احکام کی اطاعت ہوتی رہے گی۔ وہ کبھی خزاں دیدہ نہیں ہوگا۔

۴۷۔ قرآن نے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ حزب اللہ اور حزبُ الشیطان۔ مسلمان اپنے آپ کو اللہ کی پارٹی سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر اور پارٹیاں سب سے بڑا دھوکا ہے۔ پارٹیاں دو ہی ہیں

باقی سب شرک ہے۔ حزب اللہ کے اندر کوئی دوسری پارٹی ہو ہی نہیں سکتی۔

۴۸۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہر فرد کو کیا میسر آتا ہے۔

۴۹۔ شیطان، انسان کے وہ غلط معتقدات، خیالات، اور جذبات ہیں جو ہدایتِ خداوندی کے چھوڑ دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

۵۰۔ قرآن میں ہے کہ انسان کے اعمالِ خیر و شر کا ذرّہ ذرّہ تولا جائے گا لیکن ان لوگوں کے اعمال جو غلط کاموں کو بزعمِ خویش صحیح اور نیکی کے کام سمجھتے ہیں۔ اس قدر بے وزن ہوں گے کہ انہیں تولنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی۔ (۱۸/۱۰۵)

۵۱۔ غلط اور صحیح کا معیار قانونِ خداوندی (قرآن) ہے۔ کسی کی نیک نیتی غلط کو صحیح نہیں بنا سکتی۔

۵۲۔ یہ واضح ہے کہ تقلید کی روش بڑی نیک نیتی سے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ نیک نیتی عقیدت کی حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ قرآن نے اسے اسلاف کو خدا بنا لینے سے تعبیر کیا ہے (۹/۳۱)

۵۳۔ انسان جیسے ہی اللہ کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے۔ وہ نسلِ انسانی کی تمام نسلی، جغرافیائی، ثقافتی اور لسانی قومیتوں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

۵۴۔ جب تک آپ اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں۔ آپ قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتے۔ قرآن کی رُو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے۔ جب امّت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔ (۶/۱۵۴)

۵۵۔ آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہوتی جائے کہ اس کی انفرادیت کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کی تکریم اور احترام میں فرق نہ آئے اور اس کی خودی (ذات) کی تکمیل ہوتی جائے۔

۵۶۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو انسانی آزادی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ (۹/۳۱)

۵۷۔ "اللہ کے قاعدے کے مطابق چلو گے تو اللہ دیتا ہے"۔ ویسے ہی "اللہ دے گا" کا ورد نہ کرو۔

۵۸۔ انسانوں کی واحد حکومت، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہو گی۔ دوسرے معنوں میں خدا کی کتاب "قرآن" کی حکومت۔

۵۹۔ کعبہ ایک شعار ہے۔ ایک علامت ہے، نظامِ خداوندی کا کہ جہاں نوعِ انسان امن پا سکے گی۔ آج دنیا کے ستائے ہوئے انسان کے لئے ساری دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں اسے امن مل سکے۔ اور خدا نے اس گھر کے متعلق کہا ہے کہ یہ نوعِ انسان کے لئے امن کی جگہ ہے۔ "قیاماً لِلنّاس" ہے۔ تاکہ نوعِ انسانی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔

۶۰۔ دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے۔

۶۱۔ مقصودِ تخلیق انسانی یہ ہے کہ تمام انسان ایک امّت (ایک عالمگیر برادری) بن کر رہیں اور باہمی اختلافات پیدا نہ کریں۔ یہ اختلافات صرف وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مٹ سکیں گے۔ یہ زندگی رحمت کی زندگی ہے۔ جو لوگ وحی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے ان کے اختلافات مٹ نہیں سکیں گے۔ یہ عذاب کی زندگی ہوگی۔

۶۲۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ حقیقت کو طوعاً (بہ طیبِ خاطر) نہیں مانتے۔ حقیقت ان سے اپنے آپ کو کرہاً (مجبوراً) منوالیتی ہے۔

۶۳۔ زندہ رہنے کا حق اسے حاصل ہے جو ثبوت بہم پہنچا دے، اس بات کا کہ مجھ میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور یہ صلاحیت ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ عافیت کے گوشوں میں رہ کر حاصل نہیں ہوتی۔

۶۴۔ جس نظام میں کوئی صاحبِ جوہر اپنے مقام پر نہیں رکھا جاتا۔ وہ نظام ملوکیت ہے شیطنیت ہے۔

۶۵۔ انسان انسانیت کی سطح پر آتا ہی اس وقت ہے جب اس میں تخلیق کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔

۶۶۔ تین لعنتیں بوجہِ انسانی کے لئے جذام و سرسام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ہیں، ملوکیت مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری۔

۶۷۔ قوموں کی زندگیاں ان ایام سے ناپی جاتی ہیں۔ جن کا حساب کتاب ہزار ہزار سال سے ہوتا ہے۔

۶۸۔ ہر سانس میں انسان کی زندگی بنتی اور بگڑتی چلی جاتی ہے۔

۶۹۔ کائنات کو فریب و سراب کا نام دینے والے افلاطونی طلسم کی دھجیاں، قرآن نے یہ کہہ کر بکھیر دیں کہ ہم نے ارض و سماوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔

۷۰۔ جو کسی کا محتاج نہیں وہ کسی کا محکوم بھی نہیں رہ سکتا۔

مرتبہ:۔ (ثریا عندلیب)

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں۔ ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

حفاظتِ قرآن

تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے ایک اسلامی تاریخ کا طالب علم اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مسلمانوں کی شب و روز کی فتوحات نے یہودیوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا کہ جو درس حضرت ابوبکر صدیقؓ "شاہکارِ رسالت" حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کو "رہبرِ کامل" نے دیا تھا۔ جب تک اس درسِ عظیم کے خدوخال باقی ہیں یہ سیلاب رکنے والا نہیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ مسلمان جو راتوں کو جاگ کر شب آگہی کرتے۔ سربسجود رہتے اور دن بھر باطل کے خلاف برسرِ پیکار رہتے۔ پورے کرّہ ارض کے وارث نہ بن جائیں۔ چنانچہ مغرب میں جبرالٹر تک اور مشرق میں وطنِ عزیز تک تاریخ کے ایک مختصر دور میں اسلام پھیلا اور خوب پھیلا۔

قرآن مجید آسمانی کتاب ہونے کے حوالے سے یہودیوں کی تاریخ سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ یہ پہلی آسمانی کتاب ہے جس میں روزمرّہ کی زندگی کے معمولات سے لے کر تاریخی حوالوں تک کا علم موجود ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ یہود و نصاریٰ کی تلوار نے وہ کام نہیں کیا جو ان کے قلم نے کیا ہے۔ امتِ مسلمہ کی وحدت کو پاش پاش کرنے میں یہود ہی کا ہاتھ ہے۔ مسلمانوں میں آج ان گنت فرقے بھی یہود و نصاریٰ کے پھیلائے ہوئے جالوں کا نتیجہ ہیں۔

کیا ابوبکر صدیقؓ بریلوی تھے یا دیوبندی
کیا حضرت عمرؓ حنفی تھے یا شافعی
کیا حضرت عثمانؓ اہل حدیث تھے یا مالکی
کیا حضرت علیؓ اہل تشیع تھے یا اہل سنت۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر ان سب کا جواب۔

نہیں اور یقیناً نہیں میں ہے تو پھر ہم اپنے آپ کو کیوں کسی کے ساتھ وابستہ کریں۔ اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا۔۔۔ کی موجودگی میں ہر ملا یہ کہیں کہ میں تو فلاں فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے پادریوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹنے کے لیے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ کہ اب ان بکھرے ہوئے موتیوں سے ہار بنانا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہودی ذہن قرآن مجید کو معاذ اللہ اس کی اصل صورت سے بدلنے میں ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے اس دعوے کو کیسے جھٹلایا جائے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذکر و انا لہ لحٰفظون۔ ہم نے ہی قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ اس الٰہی

سند کو انسان توڑنے سے رہا۔ قرآن مجید کے متعلق یہ عام نظریہ ہے۔ کہ حضورؐ کے زمانۂ اقدس میں یہ اونٹ کی کھال۔ کھجور کے پتوں۔ ہڈیوں اور اس قسم کی چیزوں پر لکھا ہوا تھا جو بعد میں اکٹھا کر کے اسے موجودہ صورت میں دورِ عثمانی میں تالیف کیا گیا۔ مانا کہ ایسا ہوگا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کاغذ اس زمانے میں دستیاب نہ تھا۔ حالانکہ کاغذ تقریباً چھ ہزار سال قبل چینیوں کی ایجاد ہے۔ اگر اس فراوانی میں موجود نہ تھا۔ جتنا آج ہے لیکن تھا ضرور۔ اس دور میں یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابیں کاغذ ہی کی بنی ہوئی کتابوں کی شکل میں موجود تھیں اور جن کی وہ باقاعدہ تلاوت کرتے تھے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ قرآن مجید بھی کتابی شکل میں موجود نہ ہو۔ یا اسے حضور صلعم نے موجودہ شکل دے کر ہمارے لیے چھوڑا نہ ہو۔ قرآن مجید کی پہلی آیت اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ الٓمٓ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابی شکل میں قاری کیلئے سامنے موجود ہے اسلئے "کتاب کا" لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ کتاب کے اور بھی کئی معانی ہیں۔ اور کتاب صرف کاغذ سے بنی ہوئی شکل میں کوئی شے سامنے پڑی ہو تو اسے ہی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید پہلے کتابی شکل میں حضور صلعم کے دورِ نبوت میں دفتین میں محفوظ ہوا۔ اور اسی لئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں حفاظ موجود تھے۔ کیونکہ حضورؐ ہی حفاظ کے حفظ کرنے کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔ قرآن مجید کی حفاظت کی کہانی خلافت صدیقؓ اکبر میں ہزاروں کی تعداد میں ایک جنگ میں حفاظ کی شہادت سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس طرح خلفائے راشدین کو قرآن مجید کی حفاظت کا خیال دامن گیر ہوتا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلے دو خلفائے راشدین نے کتابی شکل میں لانے کی مخالفت بھی کی ہے اور یہاں ایک سوال غور طلب ہے کہ جس جنگ میں سینکڑوں حفاظ شہید ہوئے۔ کیا ان حفاظ کو قرآن مجید اپنے طور پر حفظ تھا۔ یعنی کسی کے پاس سورۃ بقرہ سے سورۃ والناس تک لیکن آج کے موجودہ ترتیب میں نہیں۔ کسی کو سورۃ تغابن سے سورۃ اخلاص تک لیکن سب کا سب کسی کو سورۃ یوسف سے سورۃ محمدؐ تک یعنی تھا۔ پورے کا پورا حفظ مگر ہر ایک حافظ کی ترتیب اپنی تھی۔ جو کہ یقیناً ناممکن ہے۔ اور پھر ظاہر ہے کہ ان حفاظ سے سینکڑوں نمازی بھی لوٹے ہونگے۔ ان کو اپنی ترتیب حفظ ہوگی۔ اور وہ دور دراز علاقوں میں پھیل گئے ہوں گے۔ غرض دو حقیقتیں ایک ہی وقت میں ناممکن ہیں۔ یا تو حفاظ کو موجودہ ترتیب سے قرآن مجید حفظ تھا۔ جو کہ حضور صلعم کی دی ہوئی ترتیب تھی اور جو حضورؐ کے زمانہ ہی میں کتابی شکل میں موجود تھا۔ یا حفاظ نے اپنی اپنی ترتیب کے لحاظ سے حفظ کیا ہوا تھا۔ یعنی جتنے حفاظ تھے اتنی ہی تراتیب تھیں۔ اب دونوں میں سے ایک حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی۔ لہٰذا ذہن کو جو بات تسلیم ہوتی ہے۔ وہ اوّل الذکر ہی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو معاذ اللہ آج ہر فرقہ کے پاس اپنا ترتیب دیا ہوا قرآن مجید ہوتا۔

اب رہا یہ سوال کہ حضور صلعم کے زمانے میں کھجور کے پتوں۔ ہڈیوں۔ چمڑے وغیرہ وغیرہ پر

لکھا گیا تھا۔ تو اس سلسلہ میں آج کا دور سامنے رکھ کر قرآن مجید کے ساتھ عقیدت کی بات کی جائے۔

کیا آج قرآن مجید کی آیات ان گنت قسم کے آرٹ کے شاہکار نمونوں کی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مثال بے جا نہیں ہوگی کہ صدر ایوب کو ایک آرٹسٹ نے قرآن مجید کی سورۃ اخلاص چاول کے دانے پر کندہ کرکے تحفہ میں پیش کیا تھا۔ اب آنے والی دو ہزار سال بعد کی نسلیں یہ کہیں کہ چمڑے۔ ہڈیوں۔ کھجور کے پتوں کے علاوہ چاول کے دانوں پر بھی محفوظ کیا گیا تھا تو یہ آنے والی نسلوں کی بھول ہوگی۔ زمانے کی نہیں۔ اسی طرح اگر عقیدتاً اس زمانے میں اصحابؓ کرامؓ چمڑے۔ کھجور کے پتوں۔ ہڈیوں وغیرہ پر تحریر کرکے تحفتاً پیش کرتے رہے ہوں تو کیا مذائقہ ہے۔ پھر ادبی نقطہ نگاہ سے اس زمانے میں بھی عرب باقی دنیا کو عجم کہتے تھے۔ اس طرح قرآن شریف کی شان بجائے خدانخواستہ کم ہونے کے بڑھتی ہے۔ اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ سند بھی درست ثابت ہوتی ہے

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو "شاہکار رسالت" تھے۔ کا واقعہ قبولیت اسلام بھی ہمارے سامنے ہے۔ اگر آپ غور کریں تو موصوف حضور صلعم کے پاس جانے سے قبل اپنے گھر میں تشریف لاتے ہیں اور ہمشیرہ کو تکیہ پر رکھے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت میں محو پاتے ہیں۔ اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے سامنے کھجور کے پتے ہڈیاں یا چمڑے کے ٹکڑے قسم کی چیزیں کسی ٹوکری ہی میں پڑی تھیں۔ جن کی وہ تلاوت کر رہی تھیں اور پھر اس تلاوت کی ترتیب کیا ہوگی۔

حضور صلعم نے شاہ نجاشی کو جو پیغام بھیجا تھا۔ وہ بھی تو آخر کاغذ پر ہی تھا۔ اور اپنی مہر مبارک ثبت کی تھی۔ اسی طرح ایران کے خسرو پرویز کے نام جو فرمان بھیجا تھا وہ بھی تو کاغذ پر ہی تحریر تھا۔ جو کہتے ہیں کہ اوّل الذکر اب تک محفوظ ہے۔ پچھلے دنوں ایک اور خبر بھی پڑھی تھی کہ ایک اور خط بھی اسی قسم کا دستیاب ہوا ہے۔

حضرت عثمان کی شہادت قرآن مجید کی تلاوت کے دوران ہوئی۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہ قرآن مجید آج بھی سمرقند میں محفوظ ہے اور خون کے دھبے اس پر پڑے ہیں۔

بس یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ بقول حالی اسلام کو خدا اسلام کے نادان دوستوں سے بچائے۔ جو اپنی نادانی کی بدولت اسلام کا قدر اونچا رکھنے کی بجائے کم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

(عبداللہ رفیع اللہ ثانی)

لاہور کے سامعین درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (R-C-V) ہر جمعہ کو صبح ۹½ بجے B/۲۵ گلبرگ II (لاہور) میں ہوتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۰)

موضوع ہیں سے استدلال کیا ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے علماء ان آیات سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں بلکہ ان کا اصرار ہے کہ ایسی آیات میں علم سے مراد فلسفہ، تاریخ ریاضی وغیرہ کا علم نہیں بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے۔

(تفہیم القرآن از مودودی صاحب جلد چہارم ص ۲۳۲)

قرآنی علوم کے سامنے، اس قسم کے غیر علمی سلوک نے، سائنس کا علم رکھنے والے اہل علم کو مجبور کیا کہ وہ تاریکی کے اس پردے کو چاک کریں اور عامۃ الناس کے سامنے، قرآن مجید کے ایسے مقامات کی جدید سائنسی علوم کی روشنی میں تفسیر پیش کریں، تاکہ انہیں قرآنی علوم کا صحیح ادراک ہو سکے۔ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی کتاب زیر تبصرہ، ایک ایسی ہی کوشش ہے۔

ان کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن مجید کا آٹھواں حصہ ایسا ہے کہ جس میں کسی نہ کسی حوالے سے مظاہرِ فطرت جو سائنس کا خاص موضوع ہیں، کا ذکر موجود ہے (صفحہ ۱۸)

مظاہرِ فطرت کی طرف یہ اشارے بے مقصد نہیں ہیں، بلکہ یہ مسلمان اہلِ علم کو اس امر کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ ان مظاہرِ فطرت پر غور و فکر سے کام لیں اور اس کے نتیجے میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کریں۔ ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جتنا زیادہ مظاہرِ فطرت پر غور کیا جائے گا، اس سے اللہ تعالیٰ کی لامحدود قوت اور علم کا ادراک اتنا ہی زیادہ ہوتا جائیگا

مثلاً مختلف آیات کی تشریح کے ذریعے، مصنف ثابت کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں، اس امر کے اشارے موجود ہیں کہ سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد انسان خلا کو فتح کر سکتا ہے (صفحہ ۱۱۵) جب کہ دوسرے مفسرین جن کے سامنے مظاہرِ فطرت کے بارے میں سائنسی علوم کی تفصیلات نہیں آئیں، اس امر کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اب یہ ایک حقیقت بن چکا ہے اور ان کے انکار کی وجہ سے قرآن مجید کی حقانیت پر ہر حرف آتا ہے۔

کتاب کے مقدمے میں مصنف نے اس امر کی تشریح کی ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک علماء کون ہیں، اور پھر اسی کی روشنی میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر بیان کی ہے، جو حضرات قرآن مجید کا سائنسی علوم کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہترین رہنما ثابت ہوگی۔

باسمہٖ تعالیٰ

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

کہا جاتا ہے کہ بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از قیاس ہوتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال خود ہماری اپنی داستان ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ایک قوم اپنے سامنے ایک بلند و بالا، متعین، واضح اور روشن نصب العین رکھتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے دس سال تک مسلسل مصروفِ جنگ و تاز رہتی ہے۔ اس جدّ و جہد میں ساری دنیا سے لڑائی مول لیتی ہے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صبر آزما مصائب جھیلتی ہے۔ لیکن جب دس سال کی اس مسلسل جدّ و جہد کے بعد وہ نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو سوچنے بیٹھتی ہے کہ ہم نے اس کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ اس کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ ان سوالات کے ابھارنے والوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو اس جنگ میں خود شریک تھیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ دراصل ہندوؤں کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا بخت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی (بقول ان کے) اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی ہندوستان سے الگ نہ ہوتے۔ بالفاظِ دیگر اگر وہ آج بھی ذرا وسعتِ قلبی کا ثبوت دیں تو ہم ان سے فوراً گلے مل جائیں۔ دوسری طرف سے ..... یہ آواز اٹھی کہ مسئلہ دراصل معاشی تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے اس کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ہم بڑے بڑے کارخانے لگاتے، عظیم القدر الیوانات تجارت قائم کرتے، بڑی بڑی جائدادیں کھڑی کرتے۔ ہم نے پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ یعنی (بقول ان کے) یہ چند سرمایہ داروں اور زر پرستوں کی اسکیم تھی جس کے لئے قوم نے ایسی مہیب جنگ لڑی تھی۔ بعض ایک قدم آگے بڑھے اور یہاں تک کہنے میں بھی نہ کوئی باک سمجھا نہ شرم محسوس کی کہ تقسیمِ ہند درحقیقت انگریز کی اسکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔

حصولِ پاکستان کا مقصد

حصولِ پاکستان سے مقصود کیا تھا اس کے متعلق میں اپنے اس مقالہ میں بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو "نوائے وقت" کی ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان* تھا۔ "کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے"۔ اس میں، میں نے مستند حوالوں سے ثابت کیا تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام رائج کیا جا سکے۔ تجدید یادداشت کے لئے میں یہاں قائدِ اعظمؒ کے وہ چند الفاظ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) میں ارشاد فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؛ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؛ تقسیمِ ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؛ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔
>
> (قائدِ اعظمؒ کا پیغام مرتبہ سید قاسم محمود صفحہ ۵۲)

جو لوگ تقسیمِ ہند کو انگریزوں کی سکیم قرار دیتے ہیں اور قائدِ اعظمؒ کو ان کا آلۂ کار ٹھہراتے ہیں ان کے خبثِ باطن کے علاوہ، ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف انگریزوں جیسی قوم تھی جس کی سلطنت پر (اس کے زمانے میں) سورج کبھی غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ہندو تھا جس کے پاس برلاؤں اور ٹاٹاؤں کی تجوریاں تھیں۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی زمین دوز دہشت پسند تنظیمات تھیں۔ اُن کے مقابلے میں ایک نحیف و نزار، سن رسیدہ شخصیت تھی جس کے پاس نہ دولت کے خزانے تھے نہ لاؤ لشکر، نہ خفیہ تنظیمیں تھیں، نہ پوشیدہ اسلحہ۔ وہ تنہا بے ساز و یراق یہ چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی قوت تھی اور وہ تھی عظمتِ کردار کی بے پناہ طاقت۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے پاکیزہ عملِ پیہم۔ چونکہ آج ہماری قوم بدقسمتی سے اس تصور ہی سے بے گانہ ہو چکی ہے کہ حسنِ کردار کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے اور اس سے بے ساز و سامان کیسے کیسے محیر العقول کارنامے ظہور میں آ سکتے ہیں، اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ حصولِ پاکستان کا راز اس معمارِ پاکستان کے یقینِ محکم، عزمِ بلند اور بے لوث کردار میں مضمر تھا۔ میں صحبتِ امروزہ میں اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی کوئی کوشش کروں گا، بالخصوص اس اعتراض کی تردید کہ تقسیمِ ہند کی سکیم انگریز کے ذہن کی اختراع تھی اور قائدِ اعظمؒ اُس کے اس مقصد کے حصول کے آلۂ کار تھے۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریکٹر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے، اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو وہ اپنی

---

* یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے اور پمفلٹ کی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔

گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کی شہرت داغ دار ہو جائے۔ لہٰذا، ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال، کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتے۔ کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اُس نے ہنوز کوئی مقامِ بلند حاصل نہ کیا ہو، اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہے، اس میں تصنّع اور آورد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان میں اس کے جوہرِ کردار کی حقیقی جھلک دکھائی دے سکتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ نبی اکرم سے مخالفین نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

میں نے اعلانِ نبوّت سے پہلے، جب میری حیثیت معاشرہ کے ایک عام فرد کی سی تھی، تمہارے اندر زندگی گذاری ہے، میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا!

حضورؐ کے اس جواب نے (جو بزبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماپنے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق، قائدِ اعظمؒ کے کردار کی داستان، ان کی زندگی کے اس ابتدائی دَور سے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ء سے کیا جاتا ہے۔ جب "مانٹیگو، چمسفورڈ سکیم" کے سلسلہ میں، اس زمانے کے وزیرِ ہند، مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ انہوں نے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں، تلک، گوکھلے، دادا بھائی نوروجی کے علاوہ، مسٹر محمد علی جناحؒ سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جواں سال سیاست دان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کئے:۔

"ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی دلائل پیش کرنے میں زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی۔ وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناحؒ کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح اُلجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناحؒ جیسے انسان کو بھی نظامِ حکومت میں دخل حاصل نہ ہو۔"

لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد مسٹر جناحؒ نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت نامساعد تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا۔ لیکن اس پر بھی بساطِ روزگار پر اس نووارد کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ عدلیہ کے سربراہ سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیش کش کی جس کا مشاہرہ اُس زمانے میں پندرہ سو روپے تھا، تو مسٹر جناحؒ نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دے کر مسکرا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک باخود خزیدہ نوجوان کی

خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

(۰)

یہ پہلی جنگِ عظیم کے آخری دور کی بات ہے اس جنگ میں گو اتحادیوں کو یہ ہیئتِ مجموعی کامیابی حاصل ہو رہی تھی لیکن ان جراحت ہائے پیہم سے برطانیہ کی حالت بسمل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم، انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومتِ ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناحؒ کو ایسا موقع خدا دے، وہ اس زمانے میں مسز اینی بسینٹ کی قائم کردہ، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہلِ ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا:۔

ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون بہانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں! آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے..... یہ جنگ آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے! یاد رکھئے کہ یہ انداز حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناحؒ کے اس نعرۂ حریت کا اثر تھا کہ وزیرِ ہند کو دارالعوام میں اعلان کرنا پڑا کہ

ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومتِ برطانیہ کے اس حصے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادیٔ ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

وزیرِ ہند نے تو حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سر پھرے انگریز حکمران تھے جو نشۂ قوت میں بدمست، اس تصور تک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سیڈنہم اور لارڈ ولنگڈن کا نام سرِفہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے، اس صوبۂ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناحؒ کا مسکن تھا۔ جناحؒ نے ان دونوں سے جس بے باکانہ انداز سے ٹکر لی وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا نہایت ولولہ انگیز باب ہے۔

لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے، تو یہ سرمستِ بادۂ حریت، بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سیڈنہم کا نام لے کر کہا کہ

یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول

کیں۔ اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہ نمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اس دور میں جرأت و بے باکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناحؒ کو اس کا علم تھا۔ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اہالیانِ شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسٹر جناحؒ انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے، لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناحؒ نے وہاں جو شعلہ انگیز تقریر کی، اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کا یہ دن، بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

اہلِ بمبئی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناحؒ میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبۂ بے باکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں، ایک ہندو لیڈر مسٹر پی۔ ڈی۔ لام نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک درخشندہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:-

> کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناحؒ ہیں، جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناحؒ کے عزمِ صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں، دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے .... انہوں نے عوام کے حقوق کی راہ نمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِ وطن کی حیثیت سے، ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تر و تازہ رہے گا .... مسٹر جناحؒ ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں!

یہ واقعہ تو لارڈ ولنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی، مسٹر جناحؒ نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی اس زمانہ میں، شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی

استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناحؒ کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے ایڈریس میں، اہل ہند سے جنگ میں عملی تعاون کی اپیل کی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناحؒ اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

> مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ.... ہز ایکسیلینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے۔ اور ایکسیلینسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں — لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ہم اس وقت تک، حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریک کار نہ بنایا جائے۔

مسٹر جناحؒ تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے، اور دوسری طرف مسٹر گاندھی، جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، وائسرائے کو ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ

> میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادرِ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناحؒ نے حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف، صرف وار کونسل کی اس کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ وہ مختلف مواقع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ یہ استعفےٰ جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ

> حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانہ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوف تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندو شائیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے

روند دیا ہے، جن کے لئے حکومت برطانیہ نے جنگ لڑی تھی ـــــ انصاف کے بنیادی اصولوں کا عین اس وقت استیصال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ـــــ ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطّل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اُسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو، تعاون کرنا امرِ محال ہے ـــــ میری رائے میں ایک ایسی حکومت، جو زمانۂ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے مہذّب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

جنگ کے خاتمہ پر، حکومتِ برطانیہ نے اہلِ ہند کے تعاون کا صلہ اس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے، امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں محبوس انسانوں کا قتل، ہلاکو اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خونریزیوں کی داستانوں کو فراموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناحؒ نے کہا:-

رسوائے عالم رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پہ لارڈ چمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے، ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمّہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثّر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثّر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے ہیں۔

اسی قسم کے تھے مسٹر جناحؒ کے جذباتِ تہور اور آزادی کے وہ مظاہر، جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوکھلے جیسے عظیم ہندو راہنما نے کہا تھا کہ

ہندوستان کو جب بھی، آزادی نصیب ہوئی، وہ جناحؒ ہی کی بدولت ہوگی۔

مسٹر جناحؒ کے اس بے لوث کردار کی بنا پر، لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے مخالف تھے۔ اس دوران میں، وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مدِّمقابل کانگریس کا امیدوار تھا۔ "بمبئی کرانیکل" جو ٹی کانیشنل روزنامہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ووٹروں سے مسٹر جناحؒ کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ

ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے — علاوہ بریں جناحؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت بڑا امتیازی مقام عطا کر دیا ہے — اگر معمولی اختلاف کی بنا پر جناحؒ جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جد و جہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

قائدِ اعظمؒ نے کوئی انتخابی مہم شروع نہ کی لیکن ان کے ہندو دوستوں نے از خود قریب ایک سو موٹریں فراہم کر دیں اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

(۰)

اس وقت تک ہم مسٹر جناحؒ کی زندگی کے اس حصہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان کی عمومی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملّتِ اسلامیہ کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سرِ آغازِ داستان اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاستِ عالم کا موجودہ دور، میکیاولی کہلاتا ہے۔ جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکاری، عیاری، وعدہ فراموشی، پیماں شکنی وغیرہ سب جائز قرار پا جاتے ہیں۔ جو جس قدر شاطر اور چالباز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجسمے نصب کرتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار میں قائدِ اعظمؒ کے مدِمقابل انگریز، ہندو اور تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ہندو، اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۴۸ء میں، پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:۔

کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندو مت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندو مت ہزاروں سال مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

اس ہندو مت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا۔ جسے اس کی قوم "مہاتما" کہتی، اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس "مہاتما" کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان

کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو اُن کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں، جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، معمّہ ہیں۔

بہرحال، یہ تھے وہ حریف جن سے قائدِ اعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دورِ سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف، ان کے کسی بد سے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مُکر گئے ہوں۔ صاف، سیدھی دو ٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم۔ یہی تھی ان کی وہ خصوصیتِ کبریٰ جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، دنیا کے مشہور ترین اخبار —— لندن ٹائمز —— نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ

انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

دیانت دارانہ سیاست

لندن ٹائمز کے ان ریمارکس کی تائید میں قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ مسٹر اصفہانی نے اپنی کتاب (QUAID-E-AZAM, JINNAH AS I KNOW HIM.) میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کہ کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلا مقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخ نامزدگی سے دو دن پہلے، بالکل خلافِ توقع، ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریقِ مقابل کا یوں سامنے آ جانا وجہ پریشانی ہو گیا۔ ایک شام (محترم) عبدالرحمان صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرِ ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائدِ اعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دُہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائدِ اعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ

تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریقِ مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور

کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی قائدِ اعظمؒ نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ دورِ حاضرہ کی میکیاولی سیاست میں اخلاق کے دو ضابطے ہیں۔ پرائیویٹ زندگی کے لئے اور ضابطہ۔ پبلک زندگی کے لئے اور۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں:۔

(دورِ حاضرہ کی سیاست میں) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" سمجھیں گے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO MORALS, P-130)

اور اسی بنا پر اٹلی کے مشہور مدبّر (CAVOUR) نے کہا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔ (انسان نے کیا سوچا؟ ص ۲۳۵)

قائدِ اعظمؒ بھی اسی دور کے سیاستدان تھے اور ان کے فریقِ مقابل بھی اُسی سیاست کی بساط بچھائے ہوئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ ان کے اصولِ سیاست کیا تھے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا: "میرے عزیز! یاد رکھو۔ پبلک زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ (پرائیویٹ زندگی میں بد دیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن) پبلک زندگی میں بد دیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا ایسے لوگ بے راہرو ہو جاتے ہیں، جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔"

مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانتدار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے، اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟ بالفاظِ دیگر جو دیانتدار نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔

(۰)

کلکتہ کے انتخاب سے کہیں زیادہ اہم ایک اور انتخابی مہم درپیش تھی۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ وزارتیں قائم کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفےٰ دیا تو گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیلِ وزارت کے لئے کہا۔ عددی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور اُن سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کر لیں اور جب

آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نپٹ لیا جائے۔ قائدِ اعظمؒ اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ

آپ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو، میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا اور یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت متشکل کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر نے پنجاب میں آرٹیکل ۹۲ء نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آگیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی ——— (ماہنامہ المعارف لاہور۔ بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء۔ حصّہ انگریزی۔ ص۳۷) حاشیہ

مسلم لیگ فنڈ

ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ جو شخص دیانتدار نہیں وہ انسان ہی نہیں — دیانتداری کی سب سے بڑی کسوٹی روپیہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی انجمنوں، تنظیموں، جماعتوں اور معتبر شخصیتوں کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ کو اس ذمہ داری کا ایسا شدید احساس تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لئے فنڈ کی اپیل کی تو ہر روز سینکڑوں منی آرڈروں پر خود دستخط کرتے تھے۔ آپ سوچئے کہ قائدِ اعظمؒ جیسے مصروف اور نحیف و نزار شخص کے لئے ہر روز اتنی تعداد میں منی آرڈروں پر دستخط کرنا کس قدر دوبھر تھا۔ لیکن وہ خوشی خوشی ایسا کرتے۔ وہ بار بار اپنی انگلیوں کو سہلاتے اور پھر دستخط کرنا شروع کر دیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے تو فرماتے کہ "فنڈ کی اپیل میں نے کی ہے۔ لوگ میرے اعتماد پر پیسے بھیجتے ہیں۔ مجھے ایک ایک پیسے کا حساب

حاشیہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۴ جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممدوٹ وزارت کا قصہ اس طرح نہیں تھا جس طرح المعارف میں لکھا گیا ہے۔ چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر صاحب نے ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد شدہ قائدِ اعظم سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں قائدِ اعظمؒ کی اصول پرستی کی تائید میں یہ واقعہ درج کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ بعد میں المعارف میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا فیصلہ محترم جسٹس منیر اور مراسلہ نگار ہی کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان واقعہ کے مطابق ہے۔ مراسلہ نگار نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔

جیسا کہ پرویز صاحب نے متعدد بار کہا ہے یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت تک نہ تو تحریکِ پاکستان کے متعلق کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ ان حالات میں واقعات کی جزئیات میں اختلاف ممکنات میں سے ہے۔ لیکن اصل سوال قائدِ اعظمؒ کی اصول پرستی کا ہے جس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (طلوعِ اسلام)

دینا ہوگا۔ اس لئے رسیدیں مجھے ہی دینی چاہئیں۔"

آپ اس جواب کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ "مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا۔" ظاہر ہے کہ قائدِ اعظمؒ سے حساب مانگنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس لئے اس سے مطلب یہ تھا کہ مجھے ان کے پیسوں کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا۔ اور یہی ہے دیانتدار ہونے کے لئے بنیادی راز۔ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ مجھے ایک ایک پائی کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا، وہ بددیانت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ خدا پوچھے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قائدِ اعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہو گئے تو ان کی یہ روش تھی کہ جس کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اس کمرے کا بلب خود بجھا دیتے۔ اور مختلف کمروں میں چلتے پھرتے تو بلب جلانے اور بجھانے کا عمل متواتر ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ کہا کرتے کہ

اسراف گناہ ہے۔ اور اگر وہ روپیہ قوم کا ہے تو اس میں اسراف گناہِ عظیم ہے۔

(اصفہانی ۱۲۵)

یہ تھا قائدِ اعظمؒ کا کردار! انہوں نے مسلم لیگ کنونشن (۱۹۴۶ء) کی افتتاحی تقریر میں اس سوال کے جواب میں کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:۔

عزتِ نفس۔ دیانت۔ امانت۔ یقینِ محکم اور قومی مفاد کی خاطر، اپنے آپ کو محو کر دینے کے لئے ہر وقت آمادگی۔ ان امتیازات کی شدتِ احساس کو کیریکٹر کہا جاتا ہے۔

یہی تھا قائدِ اعظمؒ کا وہ کردارِ بلند جس کے اعتراف میں "دی گریٹ ڈوائٹ" کے مصنف "ایچ وی ہڈسن" نے لکھا تھا کہ

قائدِ اعظمؒ کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف، بددیانتی، یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا۔ انہیں کوئی شخص، کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی وہ مرغِ بادنما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا رخ کردار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔ وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین۔ عزتِ نفس و حمیت کے پیکر تھے۔

(تخلیقِ پاکستان۔ انگریزی۔ از جمیل الدین احمد۔ صفحہ ۲۶۶)

علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ؎

وہی ہے بندۂ حُر ضرب جس کی ہے کاری ۔۔۔ نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری۔
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے ۔۔۔ انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور اس سے ہماری نگاہ کا رُخ، اقبالؒ جیسے حکیم الامت کی نظرِ انتخاب کی طرف پلٹتا ہے۔ مسٹر جناحؒ ہندی سیاست

کی بوالعجبیوں سے دل برداشتہ ہو کر، گوشہ نشین ہو چکے تھے، دوسری طرف ہندوستان میں، انگریز اور ہندو کی ملی بھگت، ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ انہیں مسلمان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جائے۔ لیکن اقبالؒ تو دیدہ ور تھا، اس لئے اس کی نگاہ، سطح سے نیچے اتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں سے اسے وہ گہر تابدار مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناحؒ کو ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے احوال و کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ بھی رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار اور بلندیٔ مقام کی بیّن شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں لکھا:۔

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائدِ اعظمؒ کی عظمتِ کردار، نیّرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہو جاتی ہے، دوسری طرف وہ، حکیم الامّتؒ کی دیدہ وری کی بھی بیّن شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں، کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا۔ اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر سچ کر دکھایا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھے تھے۔ اس دوست نے علامہؒ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے انہیں لکھا تھا:۔

> میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملّت تک مکمل صورت میں، پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ (نوائے وقت ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

اور اب ٹیپ کا بند سنیئے۔ قائدِ اعظمؒ نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبالؒ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

> اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہا اور اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبالؒ کی تصنیفات ہیں، تو دونوں میں سے ایک چیز چن سکتا ہوں، تو میں اقبالؒ کی

تصانیف کو ترجیح دوں گا۔ (ذکرِ اقبالؒ عبدالمجید سالکؒ۔ صفحہ ۲۲۶)

عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہم سب کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائدِاعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں، جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے، لیکن جب وہ قائدِاعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کے لئے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے سٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی، اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے لیکن آگے جاکر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائدِاعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر، انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے ملّی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا ——— اسلامی لباس سے اس زمانے میں مراد شیروانی، شلوار یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناحؒ صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعۂ فال مجھ دیوانے پر پڑا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے قائدِاعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی، اور جذبات کی شدّت کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر، قائدِاعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سُنا، اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں آیا، انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے، میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ "کیا تم لوگ مجھے مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناحؒ ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبولِ انام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دلعزیزی بڑی ناپائدار ہوگی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔ لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگی جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو۔" یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیبِ سر کر لیا۔ اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گزرے۔

(۰)

اب "مہاتما" کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جایئے جس کی طرف قائدِاعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم

ہوگا وہ ایک دھوتی پہنے، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور دہلی میں بھنگی کالونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا، جس میں اس نے تقسیم ہند کے سلسلہ میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا تھا کہ اس نے ایک دن مسز سروجنی نیڈو سے کہا کہ

میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں، اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ

ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں، پھر ہم ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں، جنہیں ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے، انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بوڑھے" کو اس طرح مفلسی اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگرس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔

بہرحال، یہ تھا قائدِ اعظمؒ کا حسنِ کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

جناحؒ کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اُتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔ وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔

اس نے (بی۔ بی۔ سی) کے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مسٹر جناحؒ پاکستان کو ایک مسلم سٹیٹ کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے دیوانہ تھا۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء)۔

(اس کا باقی حصہ اگلے شمارہ میں پڑھیے)